پاکستان میں معاہدۂ عمرانی

ریاست اور معاشرے کے تعلق کی تجدید اور توسیع

ڈاکٹر سید جعفر احمد
ظفر جونیجو



IHSR
Institute of Historical & Social Research
Centre for People's History and Dynamics of Change

پاکستان میں معاہدہ عمرانی

ریاست اور معاشرے کے تعلق کی تجدید اور توسیع

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

ظفر جونیجو

ترجمہ

ندیم اختر

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

بہ اشتراک

فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ، پاکستان

زیرِنظر تحقیق فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ ، پاکستان (FES) کے زیرِاہتمام ۲۰۱۸ء میں مکمل ہوئی اور انگریزی میں اس کی اشاعت Social Contract in Pakistan کے عنوان سے عمل میں آئی ۔اس تحقیق کو اب FES کی اجازت سے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ کے تحت اردو میں شائع کیا جارہا ہے۔

اشاعتِ اوّل: ستمبر ۲۰۱۹ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۴۰۰ روپے

سرورق: خدابخش ابڑو

پرنٹر: معیز ٹریڈرز

ملنے کا پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ، ۲۳-۲۲ شہید ملت روڈ، کراچی۔

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

پیش لفظ

زیرِنظر کتاب پاکستان میں معاہدہ عمرانی کے موضوع پر کی جانے والی ایک تحقیق کا اردو ترجمہ ہے۔ مذکورہ تحقیق ۲۰۱۵ء میں فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ نامی جرمن ادارے کے ایماء پر کی گئی تھی۔ اس تحقیق کا پس منظر یہ تھا کہ ۲۰۱۸ء میں ہونے والے انتخابات سے قبل اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ پاکستان میں وہ کون سے بنیادی امور اور مسائل ہیں جن کے بارے میں ملک کے مختلف صوبوں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اتفاق رائے کا راستہ ہموار کیا جاسکتا ہے، ایک ایسا راستہ جو انتخابات کے بعد کے سیاسی عمل پر مثبت اثرات مرتب کرے اور سیاسی اداروں کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہو۔ راقم السطور کو اس منصوبے میں ایک رابطہ کار اور تحقیقی رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس ضمن میں ملک بھر کے چند منتخب اہلِ فکر و دانش کی ایک میٹنگ کا انتظام کراچی میں کیا گیا جس میں یہ بات طے ہوئی کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بھی یقیناً ایک معاہدہ عمرانی ہی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کوئی چالیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد یہ دیکھنے کی گنجائش پیدا ہو چکی ہے کہ اس عرصے میں اس آئین پر کس قدر عملدرآمد ہو سکا، آئین کے اندر جن چیزوں پر اتفاق رائے قائم ہوا تھا ان کی عملی تعبیر کس حد تک توقعات کے مطابق ثابت ہوئی اور پھر یہ بھی کہ آئین کی کون سی چیزیں ہیں جن پر مزید اصرار اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی مجلس میں یہ بھی طے ہوا کہ اُن شعبوں اور امور کی بھی

نشاندہی کی جائے جو ۱۹۷۳ء میں آئین کے خالقوں کے سامنے نہیں تھے اور جو بعد کے سماجی و سیاسی عمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی بھی آئین اپنی تخلیق و تدوین کے وقت مستقبل بعید میں سامنے آنے والے حالات اور نئے تقاضوں کے بارے میں پیشگی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے دساتیر میں ترمیم کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور ساتھ ہی ترمیم کا طریقہ کار بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین میں اگر کچھ چیزیں اس وقت جب کہ آئین بنایا گیا، موجود ہونے کے باوجود نظر انداز کر دی گئیں یا جن کے بارے میں آئین میں کوئی فیصلہ کرنے سے اجتناب برتا گیا (جیسے کہ وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقہ جات یعنی فاٹا کی کسی مستقل حیثیت کے بارے میں فیصلے کا کیا جانا) یا پھر ایسے امور جن کے بارے میں اُس موقع پر فیصلہ کرنے کے بجائے کسی مناسب وقت کے لیے مؤخر کر دیا گیا (جیسے کہ صوبوں کے دائرہ کار میں اضافے اور صوبائی خودمختاری کو بڑھانے کا موضوع)، ایسی چیزوں کے علاوہ چالیس سال کے عرصے میں ایسے مسائل اور امور بھی سامنے آ چکے تھے جن کے بارے میں سیاسی جماعتوں کو ازسرِ نو بیٹھ کر غور و فکر کرنے کی ضرورت تھی۔

ہماری مذکورہ مشاورت میں ملک بھر سے آنے والے صاحبانِ علم نے ان دونوں طرح کے موضوعات کی نشاندہی کی جس کی روشنی میں راقم السطور نے محترم ظفر جونیجو کے تعاون سے ایک رپورٹ مرتب کی جس کو فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ نے شایع بھی کر دیا۔ اس رپورٹ کی اشاعت اور مختلف سیاسی حلقوں تک اس کے پہنچائے جانے کے بعد یہ تجویز سامنے آئی کہ بہتر ہوگا کہ اس رپورٹ پر ملک کے مختلف صوبوں میں مشاورتی اجلاس بلائے جائیں اور وہاں کے مقامی سیاسی حلقوں کی آراء کو بھی رپورٹ کا حصہ بنایا جائے۔ یہ ایک بہت ہی صائب تجویز تھی۔ سو آئندہ چند ماہ میں کوئٹہ، پشاور، لاہور اور کراچی میں ایسے اجلاس منعقد کیے گئے جن میں مختلف صوبوں کی سیاسی قیادت اور وہاں سرگرمِ عمل سیاسی جماعتوں سے وابستہ اہلُ الرّائے کے علاوہ سول سوسائٹی

سے تعلق رکھنے والے صاحبانِ فہم و دانش کو بھی مدعو کیا گیا۔ ایسا ہی ایک اجلاس گلگت میں بھی منعقد ہوا۔ یہ ساری مشق اس لحاظ سے بہت سود مند ثابت ہوئی کہ اس کے ذریعے نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے سیاسی رجحانات ہمارے سامنے آئے بلکہ ان رجحانات پر بحث و مباحثے کے بعد ان میں سے ایسے نکات اخذ کرنا ممکن ہوا جن کو کہ رپورٹ میں سمویا جاسکتا تھا۔ اس ملک گیر سروے کے بعد سماجی معاہدے کے موضوع پر ایک اور رپورٹ شایع کی گئی ۔ جون ۲۰۱۸ء میں شایع ہونے والی یہ رپورٹ جولائی کے انتخابات سے ذرا قبل منظرِ عام پر آئی اور سیاسی حلقوں میں اس کو خاطر خواہ پذیرائی بھی حاصل ہوئی ۔ فریڈرک ایبرٹ اسٹفٹنگ کی اس رپورٹ کو اب انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ اوالذکر کی اجازت سے اور اس کے شکریے کے ساتھ کتابی شکل میں شایع کر رہا ہے۔

یہاں چند ایک باتوں کی وضاحت ضروری ہے ۔ اس رپورٹ کا پہلا ایڈیشن چونکہ ۲۰۱۵ء میں تیار ہوا لہٰذا اس میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ اُسی سال کے مرتب کردہ ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ کتاب کے مندرجات کو اسی پس منظر میں دیکھیں۔ یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ ابتدائی اور حتمی رپورٹ میں جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی، جن تجاویز کو پیش کیا گیا تھا اُن میں سے کم از کم ایک پر ۲۰۱۸ء کے انتخابات کے بعد عملدرآمد بھی ہو چکا ہے۔ فاٹا، جس کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی تجویز پُر زور طریقے سے رپورٹ میں دی گئی تھی وہ بالآخر خیبر پختون خوا میں ضم کیا جا چکا ہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی مفید ہو سکتی ہے کہ رپورٹ کی تیاری کے وقت ملک کے بعض ایسے سیاسی حلقے جو اس وقت کسی نئے معاہدہ عمرانی کے لیے کچھ زیادہ خوشدلی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس نقطے کی طرف مائل ہوتے نظر آ رہے ہیں کہ ملک کے بنیادی سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے حوالے سے ایک طویل المدت اتفاق رائے جمہوری عمل کے تسلسل، ریاستی اداروں کی عوامی توقعات سے مطابقت اور خود شہریوں کی

بہبود کے نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے۔

پاکستان میں ملک کو درپیش مسائل کی تفہیم اور ان مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ غور وفکر کے نقطۂ نظر سے زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ مفید ہوسکتا ہے اور اس مقصد کے حصول میں اگر یہ کتاب کوئی کردار ادا کرسکی تو ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ محنت اکارت نہیں گئی۔

آخر میں، میں اس اردو ایڈیشن کی تیاری میں جن احباب نے تعاون کیا اُن کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ محترم ندیم اختر نے انگریزی رپورٹ کو اردو میں منتقل کیا جبکہ ڈاکٹر انور شاہین نے مسودے کو مزید قابل مطالعہ بنانے کے لیے اپنے مشوروں سے نوازا۔ ہمارے سینٹر کی معاونِ تحقیق عروسہ یوسف نے مسودے کی پروف خوانی کی اور دیگر تکنیکی امور کو سرانجام دیا۔ میں ان کا ممنون ہوں۔

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

تعارف

ہم عصر پاکستان کی صورتحال کی وضاحت کے لیے دو طرح کے مشاہدات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ پہلی نوع کے مشاہدات میں ایسے معاملات کا احاطہ کیا جاتا ہے جنہیں منفی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے مشاہدات کے تحت پاکستان بلا توقف ایک ایسا ملک ہے جس میں ریاست کا اختیار اور قانون ختم ہوتا جارہا ہے، ریاست کے اداروں میں ہم آہنگی کا فقدان ہے، ان میں نااہلی، بدعنوانی کا عنصر فروغ پارہا ہے۔ قانون کی حکمرانی ناکامی سے دوچار ہے، مافیاؤں کی طاقت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، معاشرے میں اسلحے کا استعمال بڑھ رہا ہے، انصاف کا نظام کمزور اور انحطاط پذیر ہے۔ ملک میں مجموعی طور پر نظم حکمرانی کا بحران پایا جاتا ہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو کسی بھی مبصر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا نقطۂ نظر کے ساتھ ایک دوسری طرز کے مشاہدات بھی پائے جاتے ہیں۔ جس کے مطابق ملک میں متوسط طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، شہری مراکز میں نمو ہو رہی ہے، غیر رسمی شعبے کا کردار بڑھ رہا ہے، اپنی مدد آپ کے منصوبوں میں دلچسپی کا رجحان بڑھا ہے اور سول سوسائٹی کا وجود

زیادہ واضح نظر آ رہا ہے۔ دوسرے طرز کا یہ مشاہدہ ہمیں ایک روشن تصور دکھلاتا ہے۔

پاکستان میں موجود ان دو مختلف تناظر یا عوامل پر اگر نظر ڈالی جائے تو ذہن میں ایک اہم سوال یہ ابھرتا ہے کہ پہلی قسم کے عوامل میں جو نقائص جمع کیے گئے ہیں انہیں کس طرح درست کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے نقطہ نظر کے تحت جو مثبت عوامل بیان کیے گئے ہیں انہیں زیادہ بامعنی کیونکر بنایا جا سکتا ہے، تاکہ پالیسیوں اور اقدامات میں زیادہ ربط و ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا جواب ایک ہی ہے۔ پاکستان کو اس امر کی ضرورت ہے کہ ایسے نظاموں اور اقدامات کو وضع کرنے کے لیے تمام اسٹیک ہولڈرز آپس میں اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے مشاورت کا عمل جاری رکھیں تاکہ موجودہ تضادات کا حل نکل سکے اور ریاست و سماج کو ایک حقیقی جمہوری رنگ میں ڈھالا جا سکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ریاست اور سماج کے مختلف شعبوں میں عمرانی معاہدوں کی ضرورت ہے۔

یہ ابتدائی دستاویز زندگی کے مختلف شعبوں میں موجودہ صورتحال کی وضاحت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں تضادات کو اجاگر کرتے ہوئے ان شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں موجود معاہدوں اور تصفیوں پر دوبارہ غور کیا جانا ضروری ہے اور جہاں ایسے نئے معاہدوں کی ضرورت ہے جو ناگزیر ہو چکے ہیں۔

مطالعے کا خاکہ

یہ مقالہ سات حصوں پر پھیلا ہوا ہے۔ سب سے پہلے عمرانی معاہدے کے تصور پر مختصر گفتگو کی جائے گی۔ دوسرے حصے میں نوآبادیاتی ورثے کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے گا جو پاکستان کی ریاست اور سماج پر براہ راست طور پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس جائزے سے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کی وہ انتظامی پالیسیاں اجاگر ہوں گی جنھوں نے آزادی کے بعد پاکستان میں سیاسی اور سماجی عمل کو متاثر کیا تھا۔ مقالے کے تیسرے حصے میں پاکستانی ریاست کی نوعیت، اس کے تاریخی ارتقا اور پالیسیوں پر بحث کی جائے گی۔ اس باب میں سماج سے ابھرنے والے مطالبات اور تقاضوں کے آئینی حل کا تجزیہ بھی کیا جائے گا۔ چوتھے باب میں اس امر پر بحث کی جائے گی کہ کیا پاکستان کے معاشی پھیلاؤ کے حوالے سے سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک وسیع تر معاہدہ ممکن ہے۔ پانچویں حصے میں پاکستانی سماج میں تبدیلی کی نوعیت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بنیادی رجحانات کو نمایاں کیا جائے گا تاکہ اس امر کا تعین کیا جا سکے کہ ایسے کون سے شعبے ہیں جو فوری مشاورت کے

متقاضی ہیں اور جن کے حل پر اتفاق رائے ضروری ہے۔ چھٹے باب میں بعض ایسے شعبوں کو اجاگر کیا جائے گا جن پر مستقبل کے عمرانی معاہدے کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ مطالعے کے ساتویں اور آخری حصے میں ملک کے چاروں صوبوں اور گلگت ۔ بلتستان سے تعلق رکھنے والے سول سوسائٹی کے مختلف نمائندوں، دانش وروں اور سیاستدانوں کی طرف سے پیش کردہ پالیسی تجاویز اور تصورات کو شامل کیا گیا ہے۔

باب اول

عمرانی معاہدے کا تصور

موجودہ دور کے سیاسی مباحثے میں عمرانی معاہدہ (سوشل کنٹریکٹ) ایک بہت عام استعمال ہونے والی اصطلاح بن چکی ہے۔ عمومی انداز میں اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ اصطلاح مختلف سماجی گروہوں یا وسیع پیمانے پر کسی سماج کے اندر موجود تفہیم یا اتفاق رائے کی عکاسی کرتی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال اگرچہ جدید دور میں زیادہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ خاصا قدیم ہے۔ یہ اصطلاح سولہویں تا اٹھارہویں صدی کے بعض نظریات سے عبارت ہے جنہیں تھامس ہابس (1671-1581)، جان لاک (1704-1623) اور ژاں ژاک روسو (1778-1712) نے پیش کیا تھا۔ یہ تینوں عمرانی معاہدے کے سب سے نمایاں اور ممتاز نظریہ دان تصور کیے جاتے ہیں۔

ہابس نے اپنے عمرانی معاہدے کے تصور کی بنیاد انسانی زندگی کے اس قبل از سماجی دور کی تصریح پر رکھی ہے جس میں اُس کے بقول ریاست اور حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہابس اس صورتحال کو عالمِ فطرت (state of nature) کا نام دیتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ ایک بڑی ہولناک صورتحال تھی کیونکہ تصادم کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا تھا اور ہر انسان دوسرے انسان کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی حالت جنگ میں رہتا تھا۔ تاہم، فطرت کے اس مرحلے پر بھی قانون فطرت کا احساس موجود ہوا کرتا تھا جس نے انسان کے اندر فطری آزادی اور فطری حقوق کا

احساس پیدا کیا تھا۔تحفظِ ذات کے اس حق اور امن کے ماحول میں رہنے کا یہی احساس تھا جس نے انسان کو معاہدے کرنے پر مجبور کیا تا کہ وہ خوف کے جس دائمی احساس میں مبتلا ہے اس کا خاتمہ ہو سکے۔ یہی وجہ تھی کہ انسان نے خود پر حکمرانی کرنے کے اپنے حق سے دستبردار ہو کر یہ حق کسی دوسرے انسان یا لوگوں کی مجلس کو اس شرط پر تفویض کر دیا کہ دوسرے انسان بھی اپنے حقوق اس انسان یا لوگوں کی مجلس کے حوالے کر دیں گے۔ وہ اسے ''لیویاتھاں'' (Leviathan) یعنی ایک مضبوط اور مکمل اختیارات رکھنے والی مطلق حکومت قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کا عنوان بھی ''لیویاتھاں'' (Leviathan) رکھا تھا۔ ہابس ریاست کے بارے میں منفی نقطہ نظر رکھتا تھا کیونکہ اس کی بنیاد خوف پر قائم تھی۔ انسان کے بارے میں اس کا خیال کہ وہ خلقی طور پر خود غرض، جارحیت پسند ہے، کمزور خیال تھا۔ مزید برآں، ہابس کا عمرانی معاہدہ انفرادی نوعیت کا تھا یعنی محض افراد کے درمیان تھا، ریاست اگرچہ مطلق اور مکمل اختیار رکھتی تھی لیکن وہ اس معاہدے میں فریق نہیں تھی۔

جان لاک کا ''عالمِ فطرت'' کا تصور ہابس کے عالمِ فطرت سے کافی برعکس تھا۔ کیونکہ لاک کے مطابق عالمِ فطرت، امن، حفاظت اور خیر سگالی کی صورتحال کا نام تھی۔ انسان کو آزادی بھی حاصل تھی اور اس کی آزادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی حائل نہیں تھی۔ زندگی، آزادی اور ملکیت سے متعلق اسے تین طرح کے فطری حقوق حاصل تھے۔ عالمِ فطرت میں اگرچہ امن کی صورتحال تھی لیکن بعض مشکلات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر فطرت کے قوانین کی کوئی واضح تعریف نہیں تھی، اس لیے قانون کی تشریح کے لیے کوئی موجود نہیں تھا اور قانون کو نافذ کرنے والی کسی اتھارٹی کا وجود بھی نہیں تھا، یہی وہ اسباب تھے جس نے انسان کو ایک دوسرے سے معاہدہ کرنے اور ایک سول سوسائٹی یا ریاست کو تخلیق کرنے پر مجبور کیا۔ لاک سول سوسائٹی اور ریاست کے درمیان واضح امتیاز نہیں کرتا۔

جے جے روسو نے اپنی کتاب Discourse on the Origin of Inequality

میں عالمِ فطرت سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ روسو بھی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ انسان نے عالمِ فطرت کے دوران ایک پرامن زندگی گزاری تھی لیکن دو وجوہ ایسی تھیں جن کے باعث یہ مرحلہ اختتام پذیر ہو گیا۔ ان میں ایک وجہ آبادی میں اضافہ اور دوسری وجہ ذاتی ملکیت کا آغاز تھا جس نے انسانوں کو غریبوں اور امیروں میں تقسیم کر دیا۔ جس کے باعث امن اور سکون کی جگہ تنازعات اور جھگڑوں نے لے لی لہٰذا ایک پرامن زندگی کو باقاعدہ بنانے کے لیے لوگوں کے درمیان معاہدوں کی ضرورت پیش آ گئی۔

اٹھارہویں صدی کے بعد سے عمرانی معاہدے سے متعلق نظریوں کی جگہ زیادہ بنیادی اور اہم نظریات نے لے لی جن میں ریاست کے ماخذ اور کردار کی وضاحت کی گئی ہے، اس کے باوجود علمی نقطہ نظر اور سماجی تنظیم اور ریاست کے مقصد کے حوالے سے انسانی فہم میں ہونے والے ارتقا کا کھوج لگانے کے لیے ان پرانے نظریات کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ ان نظریات کا جائزہ لینے سے ابتدائی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریے اپنی جگہ زیادہ خیالی اور موضوعی(subjective) تھے، تاہم ہمیں یہ ضرور بتاتے ہیں کہ ماضی میں انسان نے اپنے لیے کیا مثالی تصور قائم کیا تھا۔ یہ نظریات ہمیں باہمی رضامندی کے اصول پر قائم ماحول میں ایک منظم مثالی زندگی بسر کرنے کی انسانی خواہش کے بارے میں بھی آگاہی فراہم کرتے ہیں۔

عمرانی معاہدے سے متعلق نظریات کی اہمیت اس حقیقت کے باعث بھی ہے کہ ریاست کی تشکیل کے حوالے سے وہ قبل ازیں موجود تصور کے ضمن میں ایک پیش رفت تھے۔ اس کی مثال یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ریاست کا ابتدائی تصور یہ تھا کہ اس کی بنیاد خداداد ہے، ریاست کی تخلیق ربانی قوتوں نے کی ہے، بادشاہوں یا سلطانوں کو خدا نے مقرر کیا ہے اور وہ صرف الوہی طاقتوں کے سامنے جواب دہ ہیں لہٰذا وہ کسی انسانی اتھارٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ اس تصور کا مفہوم یہ تھا کہ لوگ بادشاہوں کے اختیار پر سوال اٹھائے بغیر ان کی اطاعت کے پابند تھے کیونکہ انہیں یہ باور کرادیا گیا تھا کہ بادشاہ کو مافوق الفطرت قوتوں نے اس منصب پر فائز کیا ہے۔ اس

حوالے سے بادشاہ کے خلاف جرم دراصل الوہی اختیار (اتھارٹی) کے خلاف جرم تھا۔ اس طرح ریاست کی نافرمانی مافوق الفطرت ارباب اختیار (اتھارٹیز) کی نافرمانی کے مترادف تصور کی جاتی تھی۔ ریاست کا سماوی نظریہ یا یہ تصور کہ بادشاہوں کو مافوق الفطرت طاقتوں کی جانب سے حکمرانی کے حقوق عطا کیے گئے ہیں کئی صدیوں تک قائم رہا۔ انسان کو یہ سمجھنے میں بہت زیادہ وقت لگا کہ ریاست کوئی ربانی ادارہ نہیں ہے بلکہ اسے انسانوں نے خود تخلیق کیا ہے۔ ایک بار لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک ہوگیا تو انہیں اس امر کا بھی احساس ہوگیا کہ وہ نہ تو حکمرانوں کے رحم وکرم پر ہیں اور نہ ہی انہیں ہونا چاہیے۔

اسی طرح طاقت کا نظریہ بھی انسانی فکر کے تاریخی ارتقاء کا ایک مرحلہ تھا۔ اس نظریے کے مطابق ریاست طاقت کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ جنگوں، جارحیتوں، فتوحات اور دوسرے انسانوں کو محکوم بنانے کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس نظریے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ طاقتور کمزور کو اپنا محکوم بنا سکتا ہے اور اسے محکوم بنانا بھی چاہیے۔ یہ نظریہ کمزور کے خلاف زیادہ طاقتور ریاست کی جارحیت کو جائز بھی قرار دیتا ہے۔

طاقت کا نظریہ بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک اس امر کا ادراک نہیں ہوگیا کہ یہ ایک خطرناک نظریہ ہے اور صرف طاقتور ترین کے زندہ رہنے کے تصور کے فروغ کی راہ ہموار کرتا ہے۔

عمرانی معاہدے کے نظریات، ریاست کے سماوی نظریے اور نظریہ طاقت کی پیش قدمی کا نتیجہ ہیں۔ عمرانی معاہدے کے نظریوں میں انسانی سماج میں ارتقاء کے تین مراحل یعنی فطری ریاست، عمرانی معاہدہ اور سول سوسائٹی و ریاست کا ظہور شامل ہے۔ جیسا کہ ان اصطلاحات سے واضح ہوتا ہے کہ فطری ریاست ایسی تھی جس میں انسان خود اپنے بنائے ہوئے کسی قانون کا نہیں بلکہ صرف فطرت کا تابع اور پابند تھا۔ انسان کو بعض ''فطری'' حقوق ضرور حاصل تھے۔ لیکن وہ انہیں صرف اپنی فطری طاقت کی بنیاد پر ہی یقینی بنا اور حاصل کرسکتا تھا۔

عمرانی معاہدے کے نظریہ دانوں کا کہنا تھا کہ فطری ریاست، انسانی سماج کی ایک دوسری حالت کے ذریعے اس وقت تبدیل ہوئی جب انسانوں نے ایک دوسرے سے معاہدے کر لیے۔ یہ رضا کارانہ معاہدے تھے جن کے دو شعبے تھے۔ ایک سیاسی شعبہ تھا جس نے ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی اور دوسرا شعبہ سماجی تھا جو سول سوسائٹی کی تخلیق کا باعث ثابت ہوا۔ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ معاہدہ کرنے والے افراد اس فیصلے کے نتیجے میں اپنے بعض فطری حقوق سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے وسیع تر سماج اور ریاست میں شامل ہو کر اپنی فطری تنہائی سے نجات حاصل کر لی۔ اس طرح عمرانی معاہدے کے نتیجے میں سول سوسائٹی اور ریاست کی تخلیق ہوئی۔ چونکہ عمرانی معاہدے کے نظریات مثالی اور قیاسی نوعیت کے تھے، لہٰذا وہ ریاست کی تشکیل و تعمیر کے لیے زیادہ عرصے تک مضبوط بنیادیں فراہم نہیں کر سکے لیکن عمرانی معاہدے کی اصطلاح آنے والی کئی نسلوں کی سیاسی لغت میں باہمی رضامندی اور مذاکراتی معاہدوں کی مناسب تشریح کے لیے کام آتی رہی جنہیں جمہوریت کی بنیادی اقدار تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ تناظر ہے جس کے تحت زیر نظر مطالعے میں بھی یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

نو آبادیاتی ورثہ

گزشتہ سات دہائیوں کے دوران پاکستان کو جن تمام سیاسی اور سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے ان میں سے زیادہ تر کی ابتداء برطانوی نو آبادیاتی حکمرانی کے دور کی پالیسیوں سے ہوئی ہے۔ 1857 میں جب برطانوی قبضہ مکمل ہوا تو اس کے بعد برصغیر تقریباً 90 سالوں تک نو آبادیاتی تسلط میں رہا۔ اس مدت میں اگر 1857ء سے قبل کے 100 سالوں کو بھی شامل کرلیا جائے کیونکہ جب 1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کو اپنی عملداری میں شامل کر کے ہندوستان کے علاقے پر پہلا قبضہ کیا تھا تو اس طرح برطانوی حکمرانی کی کل مدت ایک سو نوے سال ہو جاتی ہے۔ یہ پورا دور فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس مدت کے دوران برطانوی حکومت نے سماجی و معاشی شعبوں کے علاوہ انتظامی شعبے میں دوررس تبدیلیاں متعارف کرائیں۔ برطانوی حکومت نے جن پالیسیوں پر عملدرآمد کیا ان کے نتیجے میں ہندوستانی سماج تبدیلیوں کے عمل سے گزرا اور اس کے اثرات ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو ان پالیسیوں نے اس ملک کے سماجی و معاشی ارتقا کے ساتھ سیاسی عمل پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔

ہندوستان کے سماجی و معاشی شعبے میں برطانیہ نے اس وقت کی زرعی معیشت میں جس نوع کی مداخلت کی، اُس کے نتیجے میں جو زرعی نظام وجود میں آیا اسے حمزہ علوی نے نو آبادیاتی طرز پیداوار

(Colonial Mode of Production) کا نام دیا ہے[1] زرعی اشرافیہ کو زمین کے مالکانہ حقوق دے کر برطانیہ نے ایک ایسا زمیندار طبقہ پیدا کر دیا جس نے معاشی اور سیاسی دونوں حوالوں سے اس کی حکومت کو مدد فراہم کی۔ اس طبقے کے مفادات کو جب بھی کوئی خطرہ درپیش ہوا تو برطانوی حکومت نے اس کی مدد کرنے میں کبھی کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ برطانیہ نے اس طبقے کو ایسی غلط کاریوں سے بھی باز رکھا جو آگے چل کر اسے نقصان پہنچا سکتی تھیں[2] زرعی اشرافیہ کا یہ وہ طبقہ تھا جس نے اس وقت برطانوی حکومت کے لیے ایک کارآمد سیاسی کردار ادا کیا جب ہندوستان میں سیاسی ادارے قائم کر دیے گئے۔

برطانیہ نے ہندوستان میں مواصلات کے وسیع نظام، سڑکوں اور سرنگوں کی تعمیر، ڈیموں اور گودیوں کی تعمیر کے لیے پالیسیاں بنائیں اور ابھرنے والے کاروباری طبقے کی اعانت کی جو اپنی ترقی کے لیے نوآبادیاتی حمایت کا ہمیشہ مرہون منت رہتا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اگرچہ پاکستان کے حصے میں مقامی سرمایہ داروں کا ایک چھوٹا طبقہ آیا تھا لیکن آنے والے سالوں میں ریاست کی سرپرستی کے باعث وہ خوب پھلا پھولا۔ ریاست نے بعض پالیسیوں کے ذریعے اس طبقے کو وسعت دی۔ ان پالیسیوں کے تحت پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن (PIDC) کے ذریعے ریاست کی نگرانی میں صنعتیں لگائی گئیں اور جو بعد ازاں بڑی آسان شرائط پر نجی شعبے کو منتقل کر دی گئیں۔

برطانیہ نے نظمِ حکمرانی اور انتظامی لحاظ سے ہندوستان کو علاقائی انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پریذیڈنسیاں، صوبے، نوابی ریاستیں، کمشنریاں اور مرکزی یا صوبائی انتظام کے تحت قبائلی علاقہ جات وجود میں آ گئے۔ صوبوں کے لیے ایک قسم کا وفاقی بندوبست وضع کیا گیا تھا، تاہم یہ نظام ہندوستان کی تقسیم کے وقت تک مکمل شکل اختیار نہیں کر سکا تھا۔ ہندوستان میں زیادہ تر سیاسی عمل اور آزادی کی تحریک کا مرکز بھی یہی صوبائی علاقے تھے۔ مزید برآں، صوبوں نے بھی ارتقائی عمل سے گزر کر ایک شکل اختیار کی تھی۔ اس عمل کے تحت سب سے پہلے

دیہاتوں، تحصیلوں اور چھوٹے شہروں میں نمائندگی کے اصول کو متعارف کرایا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمائندگی کا اصول بالائی سطح تک پہنچ گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 نے صوبائی دائرہ اختیار کو ایک مناسب شکل عطا کی۔

نمائندگی کے اداروں کو متعارف کرانے کے علاوہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ مردم شماری منعقد کرائی اور یہ عمل مختلف وقفوں کے بعد بدستور جاری رہا۔ مردم شماری کے بعد ہندوستان میں آبادی کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آیا اُس نے یہ ممکن بنا دیا کہ ہندوستانی سیاست، انتخابی حلقوں اور ان میں رہنے والوں کی عددی قوت اور ثقافتی شناخت کے حوالوں سے متشکل کی جانے لگی۔

آزادی کے بعد پاکستان کے سماجی، سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایک طویل مدت کے گزرنے کے بعد ہی بعض مقامی اور بین الاقوامی عوامل کی وجہ سے بالخصوص سماجی حالات میں تبدیلی کے عمل کا آغاز ہوا۔ یہ تبدیلیاں حکومت کی کسی باقاعدہ سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ نہیں تھیں۔ یا پھر یہ کہ حکومتیں جزوی طور پر ان پالیسیوں کو لانے کی ذمہ دار تھیں۔ ان تبدیلیوں کے پس پردہ بعض لوگوں کی انفرادی پہل کاریاں زیادہ نمایاں تھیں۔ ان تبدیلیوں کے لیے جو بھی سرکاری ترغیب مددگار ثابت ہو سکتی تھی وہ زیادہ نمایاں طور پر نظر نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں زیادہ تر ترقی کسی مربوط منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوئی۔ ملک کے بہت سے علاقوں میں جو ترقی ہوئی ہے وہ لوگوں کی اپنی پہل کاری کا نتیجہ ہے جنہوں نے اپنے گھر بنائے اور کاروبار شروع کرنے کے ذرائع خود تلاش کیے اور ان کے گرد جو صارفیت کا نظام بن رہا تھا، اُس سے فائدہ اٹھانے کی استعداد حاصل کی۔

آگے آنے والے ابواب میں پاکستان میں عمرانی معاہدے کے مسئلے کا تین اہم جہتوں یعنی اول۔ ملک میں ریاست کی تشکیل، دوم۔ معاشی نظام اور سوم۔ سماجی ماحول کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے گا۔ ان ابواب کو شروع کرنے سے پہلے اس امر کا تعین کر لینا کارآمد ہوگا کہ عمرانی

معاہدے کے تصور کو اگر تین سطحوں پر دیکھا جائے تو اسے بہترین انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ معاہدے کی تین سطحیں یہ ہیں: ریاست اور فرد کے درمیان، ریاست اور پاکستان کی قومیتوں کے درمیان اور ریاست اور سماجی طبقات کے درمیان۔ درج ذیل ابواب میں پاکستان میں ان سطحوں پر عمرانی معاہدے کو عملی شکل دینے کے امکانات کی نشاندہی بھی کی جائے گی۔

باب سوم

پاکستان میں ریاست کی تشکیل

آزادی سے قبل بانیانِ پاکستان نے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ملک پارلیمانی اور وفاقی طرزِ حکومت پر مبنی ایک جدید ریاست ہوگا۔ مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح کے سامنے جب بھی صوبائی خود مختاری کا سوال آیا تو انہوں نے کبھی اپنے خیالات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے نفاذ کے فوراً بعد سے ہی مسلم لیگ کے رہنما پرزور انداز میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری رکھنے والے مسلم اکثریتی صوبوں کی تخلیق کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر مسلم لیگ کا مؤقف 1940ء میں اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں 23 مارچ کو مشہور قرارداد لاہور پیش کی گئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مرکز کی عمل داری والے ہندوستانی علاقوں میں دوبارہ ردوبدل کیا جائے اور ان کی سرحدوں کی حد بندی اس طرح عمل میں لائی جائے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو مسلمان اکثریتی خطے آزاد ریاستوں کی شکل میں وجود میں آ جائیں (لیکن کسی نہ کسی طرح کل ہندوستانی بندوبست کے اندر رہتے ہوئے) جبکہ ان خطوں کے اندر تشکیلی اکائیاں (یعنی صوبے) خود مختار اور آزاد ہوں گی۔ یہ تجویز درحقیقت مخفی طور پر ایک کنفیڈرل یا ایک زونل فیڈرل اسکیم تھی۔ پاکستان کی 1947 میں تخلیق اگرچہ 1940ء کی قرارداد کا نتیجہ نہیں تھی لیکن جب پاکستان نے آزادی حاصل کر لی تو اس قرارداد کی روح کو ایک رہنما اصول کے طور پر اختیار کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے

کہ آزادی کے بعد کی پوری پاکستانی تاریخ میں 1940ء کی قرارداد صوبائی خود مختاری کے حامیوں کے لیے ایک حوالہ بنی رہی ہے جو مرکز میں اقتدار رکھنے والوں کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ انہیں بانیان پاکستان کی جانب سے صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر کیے گئے وعدے کی پاسداری کرنی چاہیے۔ البتہ نئے ملک کو جلد ہی سول ملٹری بیوروکریسی کی چندسری حکومت نے اپنے شکنجے میں لے لیا اور تحریک آزادی کے دوران کیے گئے وعدوں کی پاسداری سے انکار کر دیا گیا۔ اسی سبب اور ساتھ ہی عسکری۔ بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ کی براہ راست مداخلت کے زیر اثر پاکستان کو ایک آمرانہ ریاست بنا دیا گیا۔ جو مختصر لفظوں میں استعماری حکمرانی ہی کا تسلسل تھا۔ تاہم بعد از نو آبادیاتی ریاست میں ملک کو دو بڑے تضادات کا سامنا کرنا پڑا، آمرانہ حکمرانی بہ مقابلہ جمہوریت اور مرکزیت بہ مقابلہ صوبائی خود مختاری۔ ملک میں چلنے والی تحریکوں میں یہ دونوں تضادات کارفرما تھے۔ ان دونوں تضادات کو ایک طرف جمہوریت کے قیام یا بحالی کی تحریکوں اور دوسری جانب آئینی دستاویزات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان میں چار فوجی حکومتوں نے ملکی تاریخ کے تقریباً نصف حصے تک حکمرانی کی اور ملک میں تین آئین بنائے گئے۔ آزادی کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو اس وقت تک ایک عبوری آئین کے طور پر اختیار کیا گیا جب تک مارچ 1956ء میں ملک نے ایک نیا آئین منظور نہیں کر لیا۔ اکتوبر 1958ء میں مارشل لا نافذ کر کے اس آئین کو ختم کر دیا گیا۔ ملک کا دوسرا آئین 1962ء میں جنرل ایوب کی جانب سے نافذ کیا گیا، جنہوں نے سات سال بعد خود اپنے بنائے ہوئے آئین کو ختم کر دیا۔ تیسرا آئین 1973ء میں بنایا گیا جس کے بعد اسے ایک مرتبہ جولائی 1977ء میں معطل اور اکتوبر 1999ء میں زیر التوا رکھ دیا گیا۔

ریاست کے ناقص جمہوری کردار کا مذکورہ بالا تجزیہ ملک کی قوتوں میں موجود عدم توازن کی بھی نشاندہی کرتا ہے جس کی وجہ سے ملک، فوجی اور سویلین حکومتوں کے درمیان مسلسل جھولتا رہتا ہے۔ 14 اگست 1947ء سے 15 ستمبر 2013ء تک کے، کُل 24,140 دنوں کے دوران

ملک میں 8,989 دن (37.24 فیصد) جمہوریت اور 8839 دن (36.62 فیصد) فوجی حکومتیں، 5,825 دن (24.13 فیصد) ملی جلی مخلوط حکومتیں جن میں وردی پوش صدر اور دکھاوے کی پارلیمنٹ ہوتی تھیں اور 487 دن (2.01 فیصد) نگراں حکومتیں برسر اقتدار رہیں[۳]۔ اس صورتحال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک میں جمہوریت کو بحال کرانا اور اسے برقرار رکھنا دونوں یکساں طور پر کتنے مشکل کام ہیں۔

ایک ایسی مجموعی صورتحال جس میں ریاست پر ماورائے سیاسی قوتوں کی بالا دستی رہی ہو اور سیاسی و ماورائے سیاسی قوتوں کے درمیان مستقل عدم توازن پایا جاتا ہو، ایسی صورتحال میں سیاسی طبقے کو حاصل ہونے والی چند کامیابیاں امید کو یقینی بناتی ہیں۔ گو کہ یہ کامیابیاں محض چند ہیں لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا سیاسی طبقہ اگر جمہوری جذبے کے ذریعے اپنے اختلافات کو دور کرلے تو وہ مطلوبہ مقاصد حاصل کرسکتا ہے۔ سیاسی طبقے نے جو کامیابیاں حاصل کیں ان میں ایک ملک کے مشرقی بازو کی علیحدگی کے بعد 1973ء کے آئین کی تشکیل تھی۔ اس آئین کے ذریعے پارلیمانی طرز حکومت اختیار کیا گیا اور مرکز و صوبوں اور خود صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کو یقینی بنانے کے لیے وفاقی نظام اپنایا گیا۔ آئین میں اختیار کردہ پارلیمانی اور وفاقی دونوں نظام اگرچہ اس معیار کے اعتبار سے بالکل ناکافی تھے جس کی ملک کو ان دونوں حوالوں سے حقیقی ضرورت تھی، تاہم امر واقعہ یہ تھا کہ 24 سال کی الجھن اور تگ و دو کے بعد ایک آئین اختیار کیا گیا تھا اور یہ کہ اسے عوام کے منتخب نمائندوں نے تخلیق کیا تھا۔ لہٰذا ریاست اور اس کے سیاسی نظام کی جمہوری تعبیر کے لیے اسے ایک مناسب بنیاد کے طور پر قبول کرلیا گیا۔

جمہوری عمل کے ارتقاء کی راہ میں دو قسم کی مشکلات نے رکاوٹ پیدا کی۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ ملک پر تقریباً 19 سال تک اپنی بالادستی قائم رکھنے والی دو فوجی حکومتوں نے جمہوری عمل کو معطل کیے رکھا جبکہ دوسرے مسئلے کا تعلق ملک کے آئین کو الفاظ اور حقیقی روح کے مطابق نافذ کرنے کے حوالے سے جمہوری حکومتوں میں پائے جانے والے سیاسی عزم کے فقدان سے

تھا۔اس آخرالذکر مسئلے کی وجہ سے آئین کے چند اچھے ادارے لمبے عرصے تک بے کار پڑے رہے اور بعض عمدہ اور مفید دستوری شقوں کا نفاذ نہیں ہوسکا۔

1973ء کے آئین کے نفاذ کے فوراً بعد یہ امر عیاں ہوگیا کہ اس میں ایک مناسب اور موزوں پارلیمانی وفاقی نظام کے تقاضوں پر پورا اترنے کی گنجائش کم پائی جاتی ہے لہٰذا آئین کے نفاذ کے چند سال کے اندر ہی آئینی ترامیم اور تبدیلیوں کے مطالبات سنائی دیے جانے لگے۔ جولائی 1977ء میں جب ملک پر مارشل لاء نافذ کیا گیا تو یہ امر پہلے سے زیادہ ضروری ہوگیا کہ آئینی نظام کو ایسا ہونا چاہیے جس سے وہ جمہوری حکمرانی کے تحفظ کو ممکن بنا سکتا ہو۔صوبے وفاق سے وابستگی جاری رکھنے کے لیے زیادہ مضبوط ضمانتیں طلب کرنے لگے۔صوبائی خودمختاری کے بعض حامیوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ایسی ضمانتوں کو بھی آئین کا حصہ بنا دینا چاہیے جن کے تحت ملک میں فوجی قبضے کی صورت میں وفاقی اکائیاں کو وفاق سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق استعمال کرسکیں[1]۔1981ء میں فوجی حکومت کی مخالفت کرنے والی سیاسی جماعتوں نے تحریک بحالی جمہوریت (MRD) کا آغاز کیا۔ایم آر ڈی کی جانب سے صوبائی خودمختاری کے ایک نظرثانی شدہ پیکیج کا مطالبہ کیا گیا۔بعض سیاسی رہنماؤں نے 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق صوبوں کو خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا جبکہ خودمختاری اور حاکمیت (Sovereignty) کی اصطلاحات کو وفاقی اکائیوں کے لیے طلب کردہ آزادی کے حجم کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا۔بعض سیاسی شخصیات نے نمایاں طور پر یہ بات کہی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس وقت کی حزب اختلاف سے زبانی طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ آئین کی وفاقی اسکیم پر دس سال بعد دوبارہ غور ہوگا اور اس میں سے مشترکہ امور کی فہرست (کنکرینٹ لسٹ) کا خاتمہ کردیا جائے گا جس کے نتیجے میں اس کے تمام امور صوبوں کو منتقل ہوجائیں گے۔

آئین کے پارلیمانی کردار کی بحالی کا موضوع بھی ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے پورے دور (1977-1988) میں سیاسی بحث کا موضوع بنا رہا۔فوجی حکمران کی موت کے بعد 1988ء

میں منعقد ہونے والے ایک انتخاب کے ذریعے سویلین حکومت بحال ہوئی۔ دسمبر 1988ء اور اکتوبر 1999ء کے دوران ملک میں چار کمزور سویلین حکومتیں برسر اقتدار آئیں، ان میں بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی دو دو حکومتیں شامل تھیں۔ تاہم، ان میں سے تین حکومتوں کو جنرل ضیاءالحق کے بنائے گئے نظام کے تحت کام کرنا پڑا تھا۔ اس بندوبست کے تحت صدر، وزیراعظم اور پارلیمنٹ سے زیادہ طاقتور تھا۔ آئین کو مسخ کیے جانے کی قیمت تین سویلین حکومتوں کو چکانی پڑی۔ چوتھی حکومت میں جو نواز شریف کی دوسری حکومت تھی، صدر کے آمرانہ اختیارات تیرہویں ترمیم کے ذریعے ختم کردیے گئے۔ حزب اختلاف، جس کی قیادت بے نظیر بھٹو کررہی تھیں، نے بھی اس ترمیم کی حمایت کی تھی۔ تاہم، 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کا تختہ الٹ کر 2002ء میں آئین میں سترہویں ترمیم کے ذریعے صدر کے آمرانہ اختیارات دوبارہ بحال کردیئے۔

2008ء کے عام انتخابات میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی تو اس نے آئین میں اصلاحات عمل میں لانے اور سابق فوجی حکومتوں کی شامل کردہ آمرانہ شقوں کو نکالنے کا عمل شروع کردیا۔ اس عمل کے نتیجے میں سترہویں ترمیم کا مکمل خاتمہ کردیا گیا حالانکہ اس میں موجود بعض اچھی اور قابل قبول شقوں کو ایک نئی ترمیم کے ذریعے واپس آئین کا حصہ بنالیا گیا تھا۔ اٹھارہویں ترمیم نے آئین کے پارلیمانی کردار کو بحال کردیا۔ یہ ایک نہایت اہم فیصلہ تھا جس کے تحت بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان 2006ء میں ہونے والے میثاق جمہوریت میں کیے گئے عہد کی تکمیل کی گئی تھی۔

آئین میں مرکز اور صوبوں کے تعلقات کے حوالے سے میثاق جمہوریت کی ایک زیادہ معنی خیز تعبیر سامنے آئی۔ درحقیقت، اٹھارہویں آئینی ترمیم نے ملک کے وفاقی نظام کے سانچے میں بنیادی تبدیلی متعارف کردی۔ اس ترمیم کے ذریعے مشترکہ شعبوں کی فہرست کا خاتمہ کردیا گیا جس کے نتیجے میں 17 وفاقی وزارتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ مزید برآں، مرکز کی 34 ذمہ داریاں بھی

صوبوں کو منتقل ہو گئیں۔ مشترکہ مفادات کونسل (CCI) اس ترمیم کے باعث ایک زیادہ طاقتور ادارے کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی۔ یہ کونسل اس وقت وسیع امور سرانجام دیتی ہے جن میں ان شعبوں کے بارے میں پالیسیوں کی تشکیل، نگرانی اور انہیں ضابطوں کے مطابق بنائے رکھنے جیسے امور شامل ہیں جو وفاقی فہرست کے حصہ دوم میں موجود ہیں۔ سی سی آئی کی سربراہی وزیراعظم کرتا ہے۔ چاروں صوبوں کے وزیراعلیٰ اور وفاقی حکومت کے تین نامزد نمائندے اس کے رکن ہوتے ہیں۔ اٹھارہویں ترمیم نے نیشنل اکنامک کونسل (NEC) کی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے۔ اس آئینی ترمیم کا سب سے زیادہ معنی خیز نتیجہ صوبوں کے حلقہ اثر میں وسعت اور صوبائی خودمختاری کے حجم میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ ساتویں ایوارڈ اور اٹھارہویں ترمیم نے مل کر صوبوں کی مالیاتی حیثیت کو زیادہ بہتر بنا دیا ہے جس سے صوبوں کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔

اٹھارہویں ترمیم نے اگرچہ میثاق جمہوریت میں کیے گئے کئی وعدوں کی تکمیل کر دی ہے لیکن اب بھی کئی امور ایسے ہیں جنہیں پورا کرنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے سیاسی جماعتوں کے درمیان مزید ایک میثاق اور معاہدہ لازمی اور ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر فاٹا کے، کے پی کے میں انضمام کے بعد قبائلی علاقوں کو باضابطہ بنانے اور انہیں ملک کے وفاقی نظام میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ کے ایوان بالا یعنی سینیٹ کے انتخابات اور عملی کردار پر بھی توجہ دے کر اس ادارے کو زیادہ نمائندہ اور کارگر بنایا جانا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں عوامی نمائندگی کے مسئلے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس وقت سماج کے صرف دو پچھڑے ہوئے حلقوں یعنی، خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے لیے پارلیمنٹ میں نشستیں مختص کی گئی ہیں۔ عام نشستوں پر عموماً مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے بااثر اور امیر ارکان ہی منتخب ہوتے ہیں۔ پاکستان کے دیگر غیر مراعات یافتہ طبقوں کی ایک بڑی تعداد بالخصوص زرعی اور صنعتی کارکن جو پاکستان کی افرادی قوت کا بڑا حصہ تشکیل دیتے ہیں اور جو معیشت کا پہیہ چلانے میں کلیدی کردار ادا کرتے

ہیں، ان کی فیصلہ سازی اور قانون سازی کے عمل میں براہ راست نمائندگی ہونی ضروری ہے۔اس کے ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ سماج کی ایک اور غیر مراعات یافتہ اور پچھڑی ہوئی آبادی یعنی خواجہ سراؤں کو بھی مرکزی دھارے میں لانے کے لیے ضروری قوانین اور پالیسیاں وضع کی جائیں۔

باب چہارم

میثاق معیشت کے لازمی تقاضے

میثاق جمہوریت کی منطق اور دلیل بڑی واضح تھی۔ ملک فوجی حکمرانی کے چار ادوار سے گزر چکا تھا اور آئین اپنی مرضی سے منسوخ یا معطل کیے جاتے رہے تھے۔ سیاسی جماعتوں نے اس حقیقت کو سمجھنے میں کچھ وقت لیا کہ ملک کا سیاسی نظام دیگر اسباب کے علاوہ خود ان کی اپنی کمزوریوں اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے بھی مستقل خطرے میں رہا ہے۔ جب نواز شریف کی دوسری حکومت کو 1999ء میں ختم کیا گیا تو نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کو یہ احساس ہوا کہ ملک کے سیاسی منظرنامے سے ان دونوں کو نہ صرف جسمانی طور پر بے دخل کیا گیا ہے اور حاشیے پر دھکیل دیا گیا ہے۔ دونوں کو اپنی جلاوطنی کے دوران یہ احساس ہوگیا کہ اگر انہوں نے 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں ایک دوسرے کی حکومتوں کو کمزور نہ کیا ہوتا تو جمہوری نظام کو استحکام حاصل ہوتا اور فوج کی اعلیٰ قیادت کے لیے اقتدار پر قبضہ کرنا اتنا آسان ثابت نہ ہوتا۔ یہی وہ احساس تھا جو دونوں کو قریب لایا اور دونوں جماعتوں کی دوسری سطح کی قیادت نے طویل عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ پس پردہ مذاکرات اور مشاورتی عمل جاری رکھا جس کے بعد اب تک کی ایک دوسرے کی شدید مخالف جماعتوں، پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) اور پاکستان مسلم لیگ (نواز) کی قیادتیں بالاخر میثاق جمہوریت پر دستخط کرنے کے لیے رضامند ہوگئیں۔

یہ امر بھی ایک سچ ہے کہ میثاق جمہوریت کاغذ کا ایک ٹکڑا ثابت نہیں ہوا بلکہ یہ اتفاق رائے

اور مفاہمت کے اصول پر قائم ایک حقیقی اور بارآور سیاسی عمل کی بنیاد بن گیا۔2009ء کا ساتواں قومی مالیاتی ایوارڈ(NFC Award) صرف اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس کے پس پشت میثاق جمہوریت کا جذبہ کارفرما تھا۔ میثاق جمہوریت اٹھارہویں آئینی ترمیم کی منظوری کے لیے دوبارہ ایک قوت محرکہ ثابت ہوا۔اس میثاق نے نہ صرف معاشی، مالیاتی اور آئینی معاہدوں کو بحال کیا بلکہ اس کا اظہار ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے سیاسی برتاؤ اور رویوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ 2008ء اور 2013ء کے درمیان پی پی کی وفاقی حکومت نے پی ایم ایل (این) کی پنجاب میں قائم حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح نہ ہی پنجاب حکومت اور نہ ہی پی ایم ایل (این) نے پی پی پی کی زیر قیادت قائم وفاقی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔اسی طرز عمل کے باعث پی پی پی اور پی ایم ایل (این) کی حکومتوں نے اپنی اپنی پانچ سال کی آئینی مدت مکمل کی۔

اس صورتحال سے معلوم ہوتا ہے کہ میثاق جمہوریت نہ صرف درست اقدام تھا بلکہ اس نے سیاسی عمل کو توانائی اور وقار فراہم کر کے اپنی قدر و قیمت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔لیکن کیا ایک میثاق معیشت بھی اسی طرح اپنا جواز رکھتا ہے اور اس کی کامیابی سے قطع نظر کیا اس کا حصول ممکن بھی ہے یا نہیں اس سوال کا ہاں میں جواب دینے سے پہلے اس تنقید کا جائزہ لینا مناسب ہوگا جو اس خیال کو پیش کیے جانے کے بعد کی گئی تھی۔ درحقیقت یہ خیال ساتویں این ایف سی ایوارڈ کی منظوری کے فوراً بعد اس وقت کے وزیر خزانہ شوکت ترین کی جانب سے پیش کیا گیا تھا جنہوں نے یہ تجویز دی تھی کہ سیاسی جماعتوں کو ایک طویل مدتی معاشی پالیسی پر اتفاق کر لینا چاہیے تاکہ ملک کی معاشی ترقی کے عمل میں حکومت کی تبدیلی سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ یہ تجویز اس وقت پذیرائی حاصل نہیں کرسکی کیونکہ بعض اسباب کے علاوہ خود پی پی پی حکومت کے معاشی منتظم اور قیادت اس حوالے سے غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھی اور حکومت بھی مضبوط معاشی منصوبے سامنے نہیں لاسکی تھی۔ حالیہ دنوں میں میثاق معیشت کا خیال، موجودہ وزیر خزانہ اسحاق ڈار کی جانب سے دوبارہ

پیش کیا گیا جن کا موقف ہے کہ معیشت کو اچانک پالیسی تبدیلیوں کی زد میں آنے سے روکنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک معاہدہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ کم از کم 15 سالوں پر محیط یا تین منتخب آئینی حکومتوں کی کل آئینی میعاد کے لیے کم سے کم معاشی پروگرام کی بنیاد پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے اگر پارلیمانی توثیق حاصل کرلی جائے تو یہ منصوبہ مناسب اور قابل عمل ثابت ہوگا۔[۵] اپنی تجویز کا جواز پیش کرتے ہوئے وزیر خزانہ کا کہنا تھا:

''ملکی تاریخ کا یہ مناسب ترین وقت ہے کہ سیاسی تقسیم سے بالاتر ہوکر معاشی انصرام کے لیے کم از کم نکات اور رہنما اصولوں پر اتفاق کرلیا جائے جس کی پاس داری کا تمام سیاسی جماعتیں عہد کریں خواہ وہ حکومت میں ہوں یا حزب اختلاف میں۔ یہ اقدام معیشت کو سیاسی تبدیلیوں کی الٹ پھیر سے محفوظ رکھے گا اور سرمایہ کاروں اور دیگر معاشی عاملوں کو ایک طویل المدت یقینِ کُلی فراہم کرے گا جو معاشی نمو اور خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے''۔[۶]

اس تجویز کی اکنامک ایڈوائزری کونسل (EAC) کی جانب سے توثیق کی گئی جو معیشت دانوں، سول سرونٹس اور ملک کے دیگر معاشی منیجرز پر مشتمل تھی۔ یہ تجویز اسحاق ڈار جیسے فرد کی جانب سے پیش کی گئی تھی جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اسے حکومت کی مضبوط حمایت کے علاوہ وزیر اعظم نواز شریف کی تائید بھی حاصل ہے۔ تجویز کے محرک اسحاق ڈار کی حیثیت اس حوالے سے بھی زیادہ قابل ذکر ہو جاتی ہے جب یہ حقیقت ذہن میں آتی ہے کہ یہی وہ فرد تھے جنہوں نے اپنی سیاسی جماعت کی جانب سے میثاق جمہوریت کی تفصیلات پر رضا ربانی کے ساتھ گفت وشنید کی تھی جو پس پردہ پی پی پی کی نمائندگی کرتے ہوئے میثاق جمہوریت کے حقیقی مسودے پر مذاکرات کررہے تھے۔[۷]

وزیرِخزانہ کی خواہش اور منشا کے باوجود اس تجویز کی مخالفت کرنے والے بھی موجود تھے لٰہذا ضروری ہے کہ پہلے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے۔تنقید میں یہ کہا گیا ہے کہ میثاق معیشت کے بارے میں دیا گیا بیان خلقی طور پر سادہ اور معصومانہ ہے۔سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ اکنامک ایڈوائزری کونسل(EAC) اس طرح کا کوئی بیان دیگر سیاسی جماعتوں کو پہلے اعتماد میں لیے بغیر کس طرح جاری کرسکتی ہے۔ دوسری صورت میں یہ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے اگر دیگر سیاسی جماعتیں کسی نام نہاد میثاق معیشت کا مطالبہ کررہی ہوتیں[8]اسی تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی ایک معاشی پروگرام پر اس لیے متفق نہیں ہوں گی کیونکہ وہ اپنا الگ الگ معاشی فلسفہ رکھتی ہیں۔اس حوالے سے تبصرہ نگار پی پی پی کی مثال پیش کرتے ہیں جو علی الاعلان شریف حکومت کے نجکاری پروگرام کی مخالفت کرتی ہے، جب کہ حکومت کے ذہن پر یہ پروگرام مکمل طور پر چھایا ہوا ہے۔اس کے بعد تبصرہ نگار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اس صورتحال میں میثاق معیشت کے لیے اتفاق رائے کس طرح پیدا ہو سکے گا؟[9]یہ کہنے سے کہ وزیرِخزانہ نے دیگر سیاسی جماعتوں سے مشاورت کیے بغیر یہ خیال پیش کیا ہے یہ خیال ناقابل مدافعت نہیں ہوجاتا۔یہ تجویز ایک فورم پر پیش کی گئی ہے اور اسے دیگر فورمز پر بھی لے جایا جاسکتا ہے۔درحقیقت اگر اسے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جاتا تو یہ اس کا بہتر آغاز ہوسکتا تھا جو ایک کل جماعتی کمیٹی تشکیل دے کر اسے میثاق معیشت کا مسودہ تجویز کرکے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کرنے کی ہدایت دے سکتی تھی،اس طرح تمام سیاسی جماعتیں ان معاملات پر اتفاق کرتیں جو ان کے اپنے معاشی فلسفے کے مطابق ہوتے۔مختلف پروگرام رکھنے والی سیاسی جماعتیں صرف ان مسئلوں پر اتفاق کرسکتی ہیں جن پر ان کے لیے متفق ہونا ممکن ہوتا ہے۔

میثاق معیشت کی تجویز پر تنقید کرتے ہوئے پاکستان تحریک انصاف کے ایک مرکزی رہنما اسد عمر کا کہنا تھا کہ ’’ایک جمہوری نظام میں تمام معاشی پالیسیوں کو تو ایک طرف رکھیے ہر ایک مسئلے پر بھی اتفاق رائے پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔جمہوریت کا مطلب خیالات کا تصادم ہوتا ہے جس

میں آپ بہتر خیال کا انتخاب کرتے ہیں، یہاں بھی اسی اصول کا اطلاق ہونا چاہیے۔'' اسد عمر نے مزید کہا کہ '' امریکا میں ریپبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹی کی نہ صرف معاشی بلکہ دیگر پالیسیاں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کوئی جماعت اقتدار میں آتی ہے تو وہ اپنی پالیسیاں نافذ کرتی ہے۔''[10] اس نقطہ نظر کے حوالے سے پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ میثاق معیشت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معیشت سے متعلق ہر نکتے اور مسئلے اور '' تمام معاشی پالیسیوں'' پر اتفاق رائے کا ہونا ضروری ہے۔ درحقیقت ایک میثاق صرف پالیسی کے ان اہم شعبوں اور پالیسیوں تک محدود ہوگا جو مستقبل میں ملکی بہبود کے لیے اہم ہیں اور جن پر اتفاق رائے ضروری ہے۔ جیسا کہ وزارت خزانہ کے ایک سابق مشیر ثاقب شیرانی کا کہنا ہے۔'' یہ بہتر ہوگا کہ ان بنیادی سوالات پر ایک وسیع تر اور زیادہ عمیق اتفاق رائے (سیاسی جماعتوں کے درمیان) پیدا کر لیا جائے کہ پاکستان میں معیشت کی کیا ساخت ہوگی اور اسے کس طرح چلایا جائے گا۔'' [11]

میثاق معیشت کے تصور کے مخالفین نے جو نکات اٹھائے ہیں وہ خاصے بے وزن ہیں اور اس کی ہیئت اور دائرہ کار کی تفہیم پر مبنی نہیں ہیں۔ اس طرح کے کسی میثاق کی منطق کی فہم کے لیے سب سے پہلے معیشت کے لیے آئین کی جانب سے فراہم کردہ انتہائی اہم بنیادی ساختی اور ادارہ جاتی بندوبست سے آغاز کرنا ہوگا۔ پاکستانی آئین ایسے بہت سے معاشی اور مالیاتی ادارے فراہم کرتا ہے جو ملک کی معیشت سے تعلق رکھنے والی معاشی پالیسیاں ترتیب دیتے ہیں۔ نیشنل فنانس کمیشن پنج سالہ بنیادوں پر وفاق اور صوبوں اور چاروں صوبوں کے درمیان محصولات کی تقسیم کا فارمولا طے کرتا ہے۔ نیشنل اکنامک کونسل (NEC) تمام صوبوں کو اپنی معاشی پالیسیوں میں ایک دوسرے کو شریک کرنے کا پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے تاکہ وہ اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔ وفاقی وزارتوں کے حوالے سے بین الصوبائی رابطے کی وزارت مختلف صوبوں کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ آئینی لحاظ سے مشترکہ مفادات کی کونسل (CCI) کا کردار انتہائی اہم ہے جو پالیسیاں تشکیل دینے کے ساتھ ان کے نفاذ کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ کونسل فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے

پارٹ II میں درج محکموں سے معاملات کرنے والے متعلقہ اداروں پر نظر رکھتی ہے۔ یہ وہ محکمے ہیں جن سے وفاق اور صوبوں دونوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔

آئین اگرچہ مذکورہ بالا اداروں کے کردار اور دائرہ کار کی وضاحت بڑے صاف انداز میں کرتا ہے لیکن بالآخر نظام کو چلانے والے ہی اداروں کی کارگزاری اور آئینی ضابطوں کو روبہ عمل لانے کا تعین کرتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب سیاسی جماعتوں کا کردار شروع ہوتا ہے۔ ایک اچھا سیاسی نظام جس میں سیاسی جماعتیں آئینی بالادستی پر یقین رکھتی ہوں، باہمی معاہدے سے قوت اور توانائی حاصل کرتا ہے جس سے آئین کے مطابق کارگزاری کا عمل تسلی بخش طور پر انجام پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میثاق معیشت آئینی اداروں کو اعتبار اور سیاسی قوت مہیا کرتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہاں سیاسی جماعتوں کے درمیان معاشی اصولوں پر ایک معاہدے کی کہیں زیادہ اہمیت ہے کیونکہ پاکستان نے ایک وفاق کے طور پر رہنے کا انتخاب کیا ہے۔ وفاقی ملکوں میں بین الحکومتی تعلقات کا تعین دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک آئین کے تشکیل کردہ اداروں پر مشتمل رسمی سطح ہوتی ہے اور دوسری غیر رسمی سطح پر سیاسی جماعتیں وفاق اور اس کی اکائیوں کی حکومتوں میں سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ رسمی سطح کے معاہدے اور انتظامات اس وقت مناسب طور پر چلتے ہیں، جب کہ آئینی حکمرانی مضبوط اور سرگرم عمل ہو۔ تاہم، وفاق اور اس کی اکائیوں سے متعلق تعلقات کے تمام پہلوؤں کا رسمی سطح پر احاطہ ممکن نہیں ہوتا۔ انسانی سماج میں پیچیدگیاں اور غیر یقینیت ہوتی ہے لہٰذا وہ نازک اور پیچیدہ مسائل اور بحرانوں کے تصفیے کے لیے غیر رسمی طریقوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب آئینی ادارہ جاتی فریم ورک کو فوری اور بہترین نتائج دینے کے لیے تحرک و توانائی کی ضرورت پیش آتی ہے تو سیاسی جماعتیں زیادہ سرعت اور بھرپور ردعمل دیتی ہیں کیونکہ وہ سماج کے زمینی حقائق سے خوب باخبر ہوتی ہیں۔

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ایک سابق گورنر محمد یعقوب کا کہنا ہے کہ اس امر سے قطع نظر کہ کون اقتدار میں ہے اور کون اقتدار سے باہر، معیشت کا ایک میثاق ساختیاتی اصلاحات کے

ایک ایسے جامع پروگرام کی تیاری کے لیے اہم ہے جس کا نفاذ ایک طویل مدت تک تسلسل سے جاری رہ سکے۔[۱۲] نواز حکومت کی معاشی پالیسیوں کے نقاد اور مصنف، حکومت کے وزیر خزانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ،

''وزیر سب سے پہلے اعداد و شمار کی ہنرمندی کے ذریعے معیشت کی اصل صورت حال کو توڑ مروڑ کر بیان کرنا بند کریں اور محض اپنی حکومت کو چلانے کے لیے آئی ایم ایف کی خاموش رضامندی سے بحران پر قابو پانے کے عارضی اقدامات اٹھانے سے گریز کریں۔ایک بار جب یہ مسخ شدہ صورتحال ختم ہوجائے گی تب کہیں جاکر معاشی صورت حال کی سنگینی آشکار ہوگی جو طویل المیعاد معاشی شرح نمو کے فروغ، قیمتوں میں استحکام اور قابل عمل توازن ادائیگی کے لیے معاشی پالیسیوں کی وسیع تر تعمیر نو کے لیے درکار اقدامات کا جواز فراہم کرے گی۔ان اصلاحات کے لیے چونکہ مشکل سیاسی فیصلے کرنے ہوں گے اور ان پر عمل درآمد کے لیے طویل عرصہ درکار ہوگا لہٰذا اس ضمن میں دیگر سیاسی جماعتوں کی توثیق بھی ضروری ہوگی۔''[۱۳]

ڈاکٹر محمد یعقوب بعض ایسے شعبوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن پر سیاسی جماعتوں کا اتفاق رائے سود مند ثابت ہوگا۔ان کی جانب سے جن شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہیں: (1) مالیاتی مینجمنٹ بالخصوص وفاقی اور صوبائی میزانیوں کی بنیادی تنظیم نو، (2) براہ راست ٹیکسوں کی مد میں محصولات میں اضافے کے لیے انکم ٹیکس کے دائرے کو بڑھانا اور ایک آئینی ترمیم کے ذریعے، آمدنی کی ایک مخصوص سطح تک کسی بھی ذرائع سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی سے مساوی ٹیکس کی وصولیابی، (3) ٹیکس کے دائرے سے باہر زیر زمین معیشت کا خاتمہ جو سیاسی سرپرستی میں خوب پھل پھول رہی ہے، (4) معیشت کو دستاویزی بنانے کے لیے قانون سازی کے ذریعے اصلاحات عمل میں لاکر ٹیکس انتظامیہ کو زیادہ قابل اور پیشہ وارانہ بنانا، (5) معاشی

ترقی کے نام پر امیر طبقات کو دی جانے والی تمام پوشیدہ اور عیاں زرتلافی کا خاتمہ،(6) اسٹیٹ بینک کو وزارت خزانہ سے آزاد کرانا اور اسے، روپے کی داخلی اور بیرونی قدر میں نسبتاً استحکام کو یقینی بنانے کے لیے دانش مندانہ پالیسیوں کی تشکیل کی اجازت دینا،(7) اسٹیٹ بینک کو کمرشل بینکوں کی طرف سے نجی شعبے کو قرضے فراہم کرنے کی بجائے سرکاری سیکورٹیز میں حد سے زیادہ سرمایہ کاری پر روک لگانے کا اختیار دینا۔(8) خودانحصاری کی ایک فیصلہ کن پالیسی اختیار کر کے ملک کے معاشی مستقبل کو گروی رکھ کر بجٹ اور ادائیگیوں کے توازن میں خسارے کو پورا کرنے کی موجودہ پالیسی تبدیل کی جائے۔(9) برآمدات میں توسیع کو ترقیاتی حکمت عملی کا سنگ میل بنایا جائے اور (10) سیاسی قیادت کی طرف سے معیشت کی خطرناک صورتحال کی وضاحت اور اس بحرانی صورت سے باہر نکلنے کے لیے ناگزیر مشکل فیصلوں کے بارے میں عوام کو اعتماد میں لیا جائے۔[۱۴۰]

پاکستان کی معیشت کے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کرتے وقت عالمی سطح پر موجود مجموعی معاشی تناظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج کی دنیا میں عالمگیریت کے معاشی تقاضے قومی ریاستوں کے لیے اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ انہیں کیا انتخاب کرنا ہوگا۔ لہٰذا پاکستان کی طویل مدت معاشی منصوبہ بندی اور کسی اتفاق رائے پر پہنچنے کے لیے عالمی تناظر کو بھی پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ تناظر ہے جس میں سیاسی قیادت کو غور کرنا ہوگا کہ ملک میں ایک سماجی فلاحی ریاست کے تقاضوں کو کس طرح یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک رہنما اصول یہ ہوگا کہ ریاست کے معاشی امور پر عوام کا جمہوری کنٹرول قائم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی معاشی وسائل تک عام رسائی کا اصول بھی مساوی اہمیت رکھتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ علم، تعلیم اور انصاف تک عام انسان کو رسائی حاصل ہو۔ ایک سماجی فلاحی مستقبل کی جانب پیش رفت کے لیے ان لوگوں کی آزادی بھی لازمی ہے جو مختلف طرح کی بندشوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔

باب پنجم

سماجی تبدیلی اور اس کو درپیش چیلنجز

ایک زیادہ وسیع اور مقبول خیال کے برعکس پاکستان کا سماج جامد نہیں ہے۔ کم واقف میڈیا اور دانش وروں کا ایک حلقہ جو موجودہ حقائق کو سمجھنے کے بجائے معاملات کے بارے میں کلبیت زدہ سوچ رکھتا ہے، اس ناقص تصور کو پیش کرتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ قرون وسطیٰ میں منجمد ہے اور 21 ویں صدی میں اب تک داخل نہیں ہوسکا۔ زندگی کے مختلف شعبوں، ملک کے مختلف خطوں، مختلف عمر کے لوگوں اور صنفی گروہوں کے بارے میں جو عملی اور تجربی معلومات موجود ہیں وہ ملک کا ایک بہت مختلف نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا تعلق ایسے اہم شعبوں سے ہے کہ جن کی موجودگی کے بغیر معاملات میں امکانی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دیہی علاقوں کی بڑی تعداد شہری آبادیوں میں تبدیل ہوچکی ہے، ملک کی مجموعی داخلی پیداوار (جی ڈی پی) میں گزشتہ نصف صدی کے دوران زراعت کا حصہ قابل ذکر حد تک کم ہوگیا ہے۔ پاکستان کے اندر بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی ہے۔ میٹروپولیٹن شہروں کی آبادی میں اور ان شہروں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ یہ بعض ایسے حقائق ہیں جنہیں ملک کے حال اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سماجی تبدیلیوں کا عمل زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں رونما ہوا ہے تاہم، بعض علاقے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ زرخیز ثابت ہوئے ہیں جہاں تبدیلی کے نتائج زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبدیلی کچھ چیلنجز بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جن پر مناسب توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ ضروری ہوگیا ہے کہ پاکستانی سماج میں رونما ہونے والی ان تبدیلیوں کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔

الف:۔آبادیاتی تبدیلیاں

پاکستان کی مجموعی آبادی کی شرح نمو میں بتدریج کمی واقع ہورہی ہے۔یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آبادی میں اضافے کی شرح اس وقت 1.95 فیصد ہے۔[۱۵] جبکہ 2014ء میں ملک کی آبادی 18 کروڑ 22 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ ہر سال آبادی میں 40 لاکھ کا اضافہ ہورہا ہے۔اس طرح آبادی اور وسائل کے درمیان عدم توازن[۱۶] ملک کے لیے ایک اہم مسئلہ (چیلنج) بنا ہوا ہے۔ پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی عورت شرح پیدائش 3.8 ہے، 73 فیصد حاملہ عورتوں کو نگہداشت صحت کی پیشہ وارانہ سہولت حاصل ہے، بچوں کی شرح اموات ن صورت حال یہ ہے کہ 1000 نوزائیدہ بچوں میں سے 74 بچے موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔جبکہ پانچ سال کی عمر تک پہنچنے والے 1000 بچوں میں سے 89 بچے زندہ نہیں بچ پاتے۔[۱۷] اونچی شرح پیدائش کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کثیر جہتی نقطہ نظر اور پروگرام کی دستیابی کے باوجود اس اضافے کو موثر طور پر نہیں روکا جاسکا ہے۔حکومت اعتراف کرتی ہے کہ یہ صورتحال خواندگی کی کم تر سطح، معاشرتی اور مذہبی رکاوٹوں اور خاندانی منصوبہ بندی کو فروغ دینے میں مہارت کی کمی کے باعث پیدا ہوئی ہے۔[۱۸] حکومت کا اعتراف اس امر کو اجاگر کرتا ہے کہ اس عمل میں ایسی دیگر ایجنسیوں کو بھی شامل کیا جائے جو اس مسئلے کے حوالے سے قابو پانے کے لیے مؤثر طریقے تجویز کرسکیں جن میں ضروری نہیں کہ صرف براہ راست مانعیت حمل کی قبولیت پر توجہ مرکوز کی جائے بلکہ ترغیبات اور حوصلہ افزائی کے ذریعے اس سوچ کو عام کیا جائے کہ محدود ذرائع رکھنے والا ایک چھوٹا سا خاندان کس طرح اپنے خواب اور ارمانوں کو پورا کرسکتا ہے۔ بیٹے کی ترجیح اور معاشرے میں بیٹیوں کی کم

تر حیثیت بھی نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات میں اضافے کی ایک بنیادی وجہ ہے[19] اس مسئلے کے حوالے سے بالخصوص مرد شہریوں میں آگاہی کا فروغ اب تک ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ آبادی کی شرح میں تیز رفتار اضافے کا نتیجہ اس وقت بالخصوص بے روزگاری اور غربت، غذائی تحفظ کے خطرے اور ماحولیاتی تنزلی کی صورت میں نکلتا ہے بالخصوص جب ملک میں نظم حکمرانی کا کوئی اچھا ماضی بھی موجود نہ ہو۔

ب:۔ شہرکاری اور اس کے نتائج

1960 کی دہائی کے آغاز سے اختیار کردہ زرعی پالیسیوں اور صنعتکاری کے لیے عالمی رجحانات کی پیروی کرنے کی وجہ سے پاکستان کے سماج کو بڑے پیمانے پر دیہی آبادی کی شہروں کی جانب نقل مکانی جیسے مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مزید برآں، آبادی میں تیز رفتار اضافے کہ وجہ سے چھوٹے دیہات، بڑے قصبوں میں، بڑے قصبے، شہروں میں اور شہر بہت زیادہ بڑے شہروں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس عمل کے باعث پاکستان میں شہری مراکز کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے[20]

اس وقت شہری اور دیہی آبادی کا تناسب علی الترتیب 38.6 اور 61.4 فیصد ہے۔ 2014ء میں شہری علاقوں کی آبادی 7 کروڑ 25 لاکھ تھی جبکہ گزشتہ سال یہ تعداد 6 کروڑ 98 لاکھ تھی۔ ان اعداد و شمار کے مطابق شہروں کی آبادی میں 26 لاکھ 30 ہزار افراد کا سالانہ اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ مستقبل میں شہری علاقوں کے حوالے سے لگائے گئے تخمینے یہ بتاتے ہیں کہ شہری علاقوں کے پھیلاؤ میں اونچی شرح سے اضافہ ہوگا[21] جس کا مطلب یہ ہے کہ مسائل میں بھی زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ دیہی علاقوں سے نقل مکانی کرنے کے عوامل انتہائی افسوس ناک ہیں۔ ان میں بنیادی سہولتوں کے فقدان، بے روزگاری اور مقامی سطح پر طاقتور لوگوں کی جانب سے جبر و استحصال جیسے عوامل مرکزی نوعیت کے حامل ہیں۔

دیہاتوں کے لوگ شہروں کا رخ اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں وہاں روزگار کے زیادہ امکانات

نظر آتے ہیں۔ لیبر فورس سروے2010-11،ہمیں شہری علاقوں میں ہجرت کر کے آنے والے کارکنوں کی تعداد کے بارے میں اہم بصیرت فراہم کرتا ہے۔ پاکستان میں نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد 67لاکھ 38ہزار ہے۔ان میں سے 36لاکھ 67ہزار پنجاب،26لاکھ 19ہزار سندھ،4لاکھ 26ہزار کے پی کے اور 27ہزار بلوچستان میں آباد ہیں۔ان صوبوں کی کل مقامی آبادی کے تناسب سے تقابل کیا جائے تو نقل مکانی کر کے آنے والوں کی سب سے بڑی تعداد سندھ11.4 فیصد اور سب سے کم تعداد بلوچستان 1.1 فیصد میں موجود ہے[۲۲]۔

دیہی علاقوں میں جو محرومیاں پائی جاتی ہیں ان کا مداوا شہری مراکز میں تلاش کیا جاتا ہے۔ خراب انتظامی کارکردگی، وسائل کی کمی اور نقل مکانی کر کے آنے والوں کی بھاری تعداد کی وجہ سے شہری مراکز مسلسل دباؤ کا شکار ہیں۔ وہاں مکانوں، حفظانِ صحت، اسکولوں، نگہداشتِ صحت، صاف پانی، سڑکوں، ٹرانسپورٹ، تفریحی سہولتوں اور سب سے بڑھ کر ہر طرح کے تمام ہنر مندوں کے لیے ملازمتوں کی فراہمی کی ضروریات کہیں بڑھ گئی ہے۔شہروں میں بے روزگاری کی سطح 8.8 فیصد دیہی علاقوں 5.1 فیصد کے مقابلے میں زیادہ ہے[۲۳] نقل مکانی کر کے آنے والے افراد اور ناکافی صنعتی ترقی، شہری بے روزگاری کے دو بڑے سبب ہیں۔ بروقت اقدامات میں ناکامی اور غیر مؤثر منصوبہ بندی کی وجہ سے شہر بتدریج بے قابو ہوتے چلے گئے۔ رہائش اور سکونت کے لحاظ سے شہروں میں طبقاتی تقسیم پائی جاتی ہے جس نے نسلی تفریق کو اگرچہ ڈھانپا ہوا ہے لیکن اس صورتحال سے غریب لوگوں میں احساس محرومی کے بڑھ جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جو اپنی بے اطمینانی کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔

شہر کاری (اربنائزیشن) کے مسائل کے ساتھ دوسری جانب دیہی پسماندگی کے مسئلے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ پاکستان کے ہر شہری کو کم سے کم سطح تک کی ایک معقول و مناسب زندگی، بنیادی سہولتوں، تعلیم، روزگار کے مواقع اور صاف وصحت مند ماحول تک رسائی حاصل ہو سکے۔ دیہاتوں اور شہروں میں رہنے والے تمام لوگ ترقی اور معاشی وسیاسی

شراکت داری کا مساوی حق رکھتے ہیں لہٰذا ہر فرد کے لیے معیاری تعلیم، نگہداشت صحت، حفظان صحت اور باعزت آمدنی کو یقینی بنایا جائے۔ شہروں میں نوکریوں کے متلاشی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو اپنے کیریئر کے آغاز پر ہی بھاری تنخواہوں کا تقاضا کرتے ہیں عارضی بنیاد پر دیہی علاقوں میں اپنے پاکستانی ہم وطنوں کو پڑھانے اور خدمت کرنے کے لیے نوکریاں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ کے نوجوان بہت جوشیلے، حوصلہ مند اور مہم جُو ہوتے ہیں۔ انہیں سماجی خدمات میں شامل کرنے کی ضرورت ہے جو زیادہ آمدنی والے کئی ملکوں میں تعلیمی تربیت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

ج۔ تسلط برقرار رکھنے کے روایتی سماجی اداروں کا کمزور تر ہونا

(Weakening of theTraditional Social Institutions of Control)

آج سے نصف صدی پہلے دیہی سماج کو ذات پات کی روایتی درجہ بندی کے تحت منظم کیا گیا تھا جس میں زرعی اور مذہبی ذاتیں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں۔ زرعی ملکیت، طاقت اور اختیار کا یقینی ذریعہ تھی۔ پچھلی تین یا چار دہائیوں سے روایتی پیشے اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں کیونکہ اب فیکٹریاں اور معیشت کے جدید شعبے ان کے متبادل روزگار فراہم کرر ہے ہیں۔ اسی طرح دیہی سماج میں دست کاروں، کمہاروں، موچیوں، لوہاروں، بڑھیوں، جولاہوں اور ماشکیوں وغیرہ کی قدر وافادیت ختم ہوگئی ہے۔ یہ ذاتیں اب آمدنی کے نئے ذرائع تلاش کررہی ہیں۔ زمین پر آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ پہلے ہی سے دیہاتیوں کو دوسری جگہوں پر روزگار تلاش کرنے پر مجبور کررہا ہے جس کے باعث لوگوں نے ملک کے اندر اور ملک سے باہر کافی بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی ہے۔ یہ عمل 1960ء کی دہائی میں شروع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔

مذکورہ بالا پیش رفت سے پہلے ذات اور پیشہ وارانہ وقار کی بنیاد پر قائم سماجی مراتب کے نظام کو

ہندوستان کی تقسیم نے اس وقت منتشر اور تہہ و بالا کر دیا جب لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے سرحدوں کو عبور کیا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے آنے والے لوگ مختلف مہارتوں، سماجی پس منظر اور ثقافتی شناختوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پرانے قبیلوں، خاندانوں اور برادریوں کا اپنا تنظیمی ڈھانچہ اور ادارے مثلاً پنچایت (پانچ افراد پر مشتمل روایتی جیوری) اور جرگہ (قبائلی بزرگوں کی کونسل) ہوتے تھے۔ برادریوں کے اپنے رہنما داخلی کنٹرول، موت اور زندگی کے امور، قانونی معاملوں اور ثقافتی تقریبات وغیرہ کے بارے میں اہم فیصلے کیا کرتے تھے۔ آبادیوں کے بہت بڑے پیمانے پر تبادلے کے نتیجے میں یہ سارا نظام بکھر کر رہ گیا۔ درحقیقت، نقل مکانی کرنے والوں نے شہری مراکز میں آباد ہونے کو ترجیح دی، دیہی علاقوں میں ایسے لوگ آئے جو زراعت میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ اس غیر معمولی ردوبدل نے روایتی اداروں کے کنٹرول کو توڑ دیا۔ لہٰذا کارکن آزاد ہو کر اجرتی کارکن میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے ان کارکنوں، کاریگروں اور بے زمین لوگوں کو آزادانہ نقل و حرکت کرنے کی سہولت میسر آ گئی جو اس سے پہلے زمین داروں یا روایتی پیشوں کے پابند ہوا کرتے تھے۔ اس صورتحال کو عارف حسن نے یوں بیان کیا ہے۔ ''آگے کی جانب پر جوش حرکت پذیری اور کچھ پانے اور حاصل کرنے کے کلچر نے ایک ایسے سماج کو تبدیل کر کے رکھ دیا جس میں معاشی حرکت پذیری اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی''[۲۴] اسی طرح خاندان کے اندر بزرگوں کی بالادستی اور پدر سری سماج کی پابندیاں بھی ٹوٹ رہی ہیں جس سے نوجوانوں کو اپنی زندگی میں تجربے کرنے، اپنے فیصلے خود کرنے اور سامنے آنے والے بے پناہ مواقع سے اپنی پسند کا انتخاب کرنے کی زیادہ آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ وہ صورتحال ہے جس سے پرانی نسل ایک دہائی پہلے تک آشنا بھی نہ تھی۔

یہ انفرادیت پسندی نئی نسل کے مزاج اور رجحان پر بھی اثر انداز ہوئی ہے جو اپنے رویے میں خودسری کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ مواصلات اور ذرائع ابلاغ کے انقلاب اور معلومات تک زیادہ رسائی کے باعث نوجوان بلاشبہ زیادہ آگاہی رکھنے کے ساتھ امکانات کو تلاش اور اپنی

پسند کے انتخاب کی زندگی کے لیے خود کو وقف کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں خواہ اس کا حصول کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ یہ وہی ''آزاد'' افراد ہیں جنہوں نے اپنے آبائی گاؤں اور قصبے چھوڑ کر شہروں یا دیگر ملکوں میں جانے اور نئے کاروبار شروع کرنے کو ترجیح دی، ایسا کرنا ایک روایتی سماج میں ان کے بزرگوں کے لیے کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب کسی نائی کا لڑکا اپنے چھوٹے سے شہر میں مردوں کا ایک ''بیوٹی سیلون'' کھولتا ہے تو وہ خود کو ماضی کی ادنیٰ ذات کا ایک اطاعت گزار خادم ہونے کے بجائے ایک کاروباری، ایک پیشہ ور اور ایک کامیاب آزاد انسان تصور کرتا ہے۔ اونچی حیثیت رکھنے والے طبقات اور اعلیٰ ذاتیں اپنی زرعی آمدنی پر زیادہ انحصار کرتی ہیں اور تعلیم کے حصول کے لیے اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتیں۔ جبکہ ان کے برعکس نچلی ذاتیں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ اب وقار اور اختیار کا توازن نچلے طبقے کے حق میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اب یہ لوگ دیہی اور نیم شہری سماج کے منظر نامے میں اختیار رکھنے والے نئے اسٹیک ہولڈر کے طور پر ابھر چکے ہیں۔

تیز رفتار تبدیلی کا ایک دوسرا عنصر نقل و حمل کا انقلاب ہے جس نے نہ صرف مارکیٹنگ کے نظام کو بدل دیا ہے بلکہ لوگوں کے لیے شہری دنیا، ثقافت، طرز زندگی اور سوچ تک رسائی بھی ممکن بنا دی ہے۔ اب دیہی بستیوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہر روز شہری مراکز کا سفر کرتی ہے اور اپنے ماحول اور عائلی زندگی کو بدلنے کے لیے مؤثر آمادگی لے کر واپس آتی ہے۔ سفر کی آزادی، درحقیقت مشاہدہ کرنے اور تبدیلی کو قبول کرنے کی آزادی کا نام ہے۔ تعلیم نے دیہی ذہنوں کو بہت تبدیل کیا ہے۔ اگرچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیہاتوں میں قائم اسکول معیاری تعلیم فراہم نہیں کرتے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ خواندگی کی صلاحیت دراصل علم کی دنیا میں داخل ہونے اور علمی معیشت کا حصہ بننے کا ایک اجازت نامہ ہوتی ہے، معمولی تعلیم رکھنے والے افراد جب شہروں میں جا کر اپنی تعلیم میں اضافہ کرتے ہیں تو ان کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ دیہی علاقوں میں رہنے والے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں جذبہ اور تحریک بیدار کرنے

کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔اسی طرح ''زنجیری ہجرت'' کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔یوں ایک آزادی سے کئی آزادیاں جنم لیتی ہیں۔

د:۔ بڑے شہری مراکز میں نسلی مسائل

شہروں کے بے ہنگم پھیلاؤ کا ایک بڑا مسئلہ نسلی تنوع ہے جو اس وقت نسلی دشمنی میں تبدیل ہو جاتا ہے جب کوئی مخصوص گروہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اسے اپنے حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔اس احساس کے بعد یہ اس دوسرے گروہ کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنی محرومیوں کا ذمہ دار تصور کرتا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس صورتحال کو سیاسی جماعتیں اپنے مفاد میں بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بے اطمینانی کے بیج سماج کے اندر ہی سے اگتے ہیں۔1987ء کے بعد سے کراچی کو نسلی تناؤ کے ایک طویل دور کا سامنا رہا ہے۔یہ نسلی تناؤ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کی روزمرہ زندگی کو مفلوج کرتا رہا ہے۔شہر کی زندگی کا معمول اگر ایک دن کے لیے درہم برہم ہو جائے تو اس سے اربوں روپے کا نقصان ہو جاتا ہے۔کراچی میں کئی نسلی گروہ سیاسی طور پر سرگرم ہیں اور وہ شہر کے مختلف علاقوں میں گہرے اثر کے مالک ہیں۔ان نسلی گروہوں کے رہنما، تنازعے سے سیاسی فائدے یا نقصان کی تلافی حاصل کرنے کی غرض سے مصالحت کرنے کے بعد دوبارہ کسی دوسرے تنازعے میں ملوث ہو جاتے ہیں۔بسا اوقات شہر کے بعض علاقے (مثلاً لیاری) جنگ جو گروہوں کے درمیان میدان جنگ بن جاتے ہیں اور انہیں مختلف سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔قانون نافذ کرنے والے ادارے، گنجان آبادی، عسکریت پسندوں کی پناہ گاہوں اور ان کے پاس موجود اسلحے کے ذخیروں کی وجہ سے ان علاقوں میں بلاخوف وخطر داخل نہیں ہو سکتے۔ان علاقوں کے رہائشیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ یا تو وہ اپنے علاقے سے باہر نکل جائیں یا صرف اپنے گھروں تک محدود رہیں یا پھر متحارب گروہوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ان میں سے جو بھی صورت ہو

اس کا خمیازہ معصوم شہریوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ جبکہ عسکریت پسندی جاری رہتی ہے۔شہر میں بہت سے ایسے 'نوگوایریاز' ہیں جہاں عام شہری حتیٰ کہ سیکورٹی فورسز تک کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ مذکورہ صورتحال اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ ان علاقوں پر ریاست کی حاکمیت باقی نہیں رہی ہے۔حالیہ دنوں میں کراچی میں ایک آپریشن کا آغاز کیا گیا ہے جسے بعض حوالوں سے محض معمولی کامیابی حاصل ہوسکی ہے۔تاہم، یہ امر واقعہ ہے کہ کراچی کی صورتحال کے مجموعی تناظر میں حکمت عملی اپنائے بغیر ماضی قریب میں اس شہر کو نسلی نیز سیاسی تنازعہ سے باہر نکالنا ممکن نہیں ہوسکے گا۔ کراچی کے علاوہ دیگر شہر بھی فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم ہیں جہاں مقامی اور بین الاقوامی سرپرست ،فرقہ وارانہ کشیدگی کو مزید بھڑکا رہے ہیں۔حکومتیں اس بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنے میں اب تک مروت اور عدم استعداد کے رویے کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔

ہ:۔خواندگی،تعلیم اور صحت

پاکستان میں بالغان کی خواندگی کی مجموعی شرح 60 فیصد ریکارڈ کی گئی ہے۔خواندگی کی یہ شرح پنجاب میں 62،سندھ میں 60، کے پی کے میں 52 اور بلوچستان میں 44 فیصد ہے۔اشاریے اگرچہ خواندگی کی شرح میں ہر سال سست رفتار اضافہ دکھا رہے ہیں مگر میلینیئم ڈیولپمنٹ گولز (MDG) میں 2015ء کے لیے 80 فیصد کا جو ہدف مقرر کیا گیا تھا وہ آج بھی کافی دور ہے۔ اس وقت حکومت 2 فیصد سے بھی کم تعلیم پر خرچ کررہی ہے جو یونیسیف کی سفارش کردہ رقم کا نصف بھی نہیں ہے۔ پی ایس ایل ایم سروے (2010-11) کے مطابق قومی سطح پر 5 سے 9 سال کی عمر کے 36.3 فیصد بچے اسکول نہیں جاتے۔صوبوں کے حوالے سے مذکورہ صورتحال کچھ اس طرح ہے۔ پنجاب 28.4 فیصد، خیبر پختونخوا 35.9 فیصد، سندھ 49.9 فیصد اور بلوچستان 55.9 فیصد۔تمام علاقوں میں سرکاری، نجی، مذہبی اور این جی اوز اسکول موجود ہیں۔لیکن سندھ اور بلوچستان کے دیہی علاقوں میں نجی اسکولوں کی تعداد قابل ذکر نہیں ہے۔ چونکہ دیہی علاقے

پرائمری سطح کے نجی اسکولوں تک زیادہ رسائی نہیں رکھتے لہٰذا شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان شرح خواندگی میں بھاری تفاوت پایا جاتا ہے۔[۲۵] مزید برآں، دیہی اسکولوں میں عمارت، پینے کے پانی، باؤنڈری وال، بیت الخلاء اور بجلی جیسی بنیادی سہولتوں کی کمیابی ہے۔ دیہاتوں میں بچوں کا اسکولوں میں نہ جانا یا تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھنے کی اہم وجوہ میں تعلیم کی ناقابل برداشت لاگت، اسکولوں کا دور واقع ہونا، اساتذہ کی کمی، تعلیم کو کارآمد نہ سمجھنے کا تصور، والدین کی جانب سے بچوں کو اسکول جانے کی اجازت نہ دینا، بچے کا چھوٹا، بیمار یا معذور ہونا یا اس کا کسی جگہ ملازم ہونا یا کام کرنے جیسی وجوہ شامل ہیں۔ کارکنوں کی منڈی میں بچوں کی تعداد 18 لاکھ ہے۔ تاہم، اس تعداد میں کمی کا رجحان دیکھا جارہا ہے۔[۲۶]

ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کی طرف سے مختص بجٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو بھی مناسب اہمیت دی جارہی ہے۔[۲۷] تعلیم کے شعبے کو بنیادی نوعیت کے جن مسائل کا سامنا ہے اُن میں طبقاتی تقسیم کو دوام دینے والا طبقاتی تعلیمی نظام، تعلیم کی فراہمی میں عورتوں سے امتیاز اور تعلیمی نظام میں نااہلی اور بدعنوانی کے باعث نااہل ڈگری یافتہ لوگوں کے پیدا ہونے جیسے مسائل شامل ہیں۔ عمومی طور پر معیاری تعلیم کے حوالے سے نجی شعبے کے اسکولوں کی طلب بڑے وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے حکومت پر اپنے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے کوئی دباؤ نہیں ہے، سرکاری تعلیمی نظام میں کوئی جواب دہی نہ ہونے سے اساتذہ پر اپنی تدریسی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے بھی کوئی دباؤ نہیں ہے۔ 5 سے 9 سال کی عمر کے بچے جو اسکول نہیں جاتے ان کی تعداد کا تخمینہ 19,750,000 لگایا گیا ہے جو آج کے تعلیمی منصوبہ سازوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ دیہی علاقوں میں تعلیم کی صورتحال اس وقت بھی دگرگوں ہے۔ اس وقت بھوت اسکولوں (گھوسٹ اسکولوں) کی تعداد کا تخمینہ 2088 ہے، غیر قانونی قبضے میں 1008 اسکول اور بے کار پڑے اسکول 5,827 ہیں۔[۲۸] جبکہ سرکاری کے علاوہ نجی شعبے میں چلنے والے اسکولوں میں بھی بنیادی سہولتوں کا فقدان اور اساتذہ کی غیر حاضری یا عدم دلچسپی کا

رجحان بہت نمایاں ہے۔

مذہبی مدرسوں میں معیار، مواد اور نظم وضبط کے مسائل بھی کافی عرصے سے موجود ہیں۔ ان مدارس کی تعداد 10,340 ہے جن میں لاکھوں بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بنیادی خواندگی، تعلیم، مفت رہائش اور مفت خوراک کی فراہمی کے حوالے سے ان مدارس کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ منافرت کے فروغ میں بھی ان مدارس کے کردار کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ ان مدارس کو ایک نظام میں منظم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان مدارس کے غیر ملکی سرپرستوں اور بین الاقوامی عسکریت پسند گروہوں سے رابطے حکام کے لیے تشویش کا باعث ہیں[۲۹]۔ جو علاقے دہشت گردی کے سخت خطرے سے دوچار ہیں وہاں موجود اسکولوں، اساتذہ اور انتظامی عملے کے تحفظ کا مسئلہ پچھلی ایک دہائی سے ریاست اور سماج کے لیے انتہائی سنگین اور تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اسکولوں پر بم حملے اور طالب علموں/ اساتذہ کی ہلاکتوں کا سلسلہ اب تک نہیں رک سکا ہے۔ بعض اسکولوں کو فرقہ وارانہ نفرت کی بنیاد پر بھی حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہے[۳۰]۔

آبادی کے حوالے سے صحت کا مسئلہ اپنی تمام جہتوں کے ساتھ موجود ہے۔ صحت کے مسائل زندگی کی اوسط عمر سے صاف عیاں ہیں۔ پاکستان میں عورتوں کی اوسط زندگی 66.9 سال اور مردوں کی 64.9 سال ہے۔ یہ شرح دونوں صنفوں کی عالمی اوسط عمر یعنی 70 سال سے کہیں کم ہے۔ معذور اور ہلاک کر دینے والی بیماریوں کی شدت حالیہ سالوں میں کافی بڑھی ہے۔ حکومت نے اب تک ملینیئم ڈیویلپمنٹ اہداف (MDGs) کے تحت کیے گئے وعدوں کے باوجود صحت کے لیے جی ڈی پی کا محض 2 فیصد مختص کیا ہے۔ یہ ایک انتہائی مایوس کن صورتحال ہے جس کا تعلق براہ راست معیار زندگی، اوسط عمر، آبادی میں اضافے، شیر خوار، بچوں اور زچگی کے دوران حاملہ عورتوں کی ہونے والی اموات اور چھوت کی بیماریوں سے ہے۔

پولیو کے خاتمے کی مہم کو بھی بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ نااہلی اور بدعنوانی

کا ہے جسے کھل کر تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ جب تک اس کام میں شامل ہر فرد اپنے فرائض ایمانداری اور مکمل صلاحیت سے سرانجام نہیں دے گا اس وقت تک پولیو کا خاتمہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس مہم کے لیے اعلیٰ حکام جو رقم وصول کرتے ہیں وہ اکثر اس مہم کو آخری مرحلے تک پہنچنے نہیں دیتی۔ صحت کی خدمات تک دیہی آبادی کی رسائی بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے تاکہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ وہ دیہی آبادی جو صحت کے بنیادی مرکز (BHU) سے اوسطاً ایک کلومیٹر فاصلے پر رہتی ہے اس کا مجموعی تناسب صرف 12 فیصد ہے۔ جبکہ اکثریتی آبادی (56 فیصد) بی ایچ یو تک پہنچنے کے لیے تقریباً 10 کلومیٹر کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس تناظر میں اس باقی ماندہ 12 فیصد دیہی آبادی کی حالت زار کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو صحت کے بنیادی مرکز کی سہولت تک پہنچنے کے لیے 50 کلومیٹر کا سفر کرتی ہے۔ بلوچستان کے عوام کے لیے یہ صورتحال مزید اذیت ناک ہے جہاں بی ایچ یو تک پہنچنے کے لیے 7 فیصد افراد ایک کلومیٹر، 24 فیصد افراد 1 سے 10 کلومیٹر، 25 فیصد افراد 11 سے 25 کلومیٹر اور 44 فیصد افراد 50 کلومیٹر طویل سفر کرنے پر مجبور ہیں۔[۳۱]

و:۔ پاکستان کے نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ

پاکستان میں آبادی کا 48 فیصد حصہ 15 سے 49 سال کے جوانوں پر مشتمل ہے۔ پیداواری صلاحیت کے حوالے سے یہ آبادی کا اہم ترین اور سب سے بڑا گروہ ہے۔ اگر نوجوانوں کو تربیت دی جائے اور انہیں بہترین انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ عنصر قوم کو مضبوط اور خوش حال بنانے میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے۔ ترقی کے پروگرام میں نوجوانوں کی شمولیت کے ذریعے ان کی استعداد سازی اب ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ اس امر کے باوجود کہ حکومت کی جانب سے نوجوانوں پر ایک قیمتی انسانی وسائل کے طور پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود اب بھی ایک موثر منصوبہ بندی کی کمی بدستور موجود ہے۔ 2005-06 سے 2012-13 تک کے سات سالوں میں لیبر فورس بڑھ کر 97 لاکھ تک پہنچ

چکی ہے۔لیکن 13-2012ء میں 37 لاکھ 30 ہزار افراد بے روزگار تھے۔اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال لیبر فورس میں شامل ہونے والے لوگوں کی کل تعداد میں سے 6 لاکھ 30 ہزار افراد کو روزگار فراہم نہیں کیا جا سکا لہٰذا وہ بھی 06-2005 میں بے روزگار افراد کی ابتدائی 31 لاکھ تعداد میں شامل ہو گئے اور بے روزگاری کی شرح مزید بڑھ گئی[۳۲] ہے اور تعلیم یافتہ نوجوان اپنی قابلیت سے کہیں کم تر ملازمتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ امر حکومت اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے لیے سنگین تشویش کا باعث ہونا چاہیے۔غیر ملکی کارپوریشنوں کے ذریعے افرادی قوت کی رسد اتار چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے اور ملک کی تمام فاضل افرادی قوت یہاں جذب بھی نہیں ہوسکتی۔اب منصوبہ سازوں کو مختصر، پیشہ وارانہ تربیت کے ذریعے ایسی مہارتیں فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جن سے لوگوں کو ذریعہ معاش اور روزگار حاصل ہوسکے۔[۳۳]

ز:۔خاندانی نظام میں تبدیلی اوراس کی حرکیات

سماجی، معاشی اور ثقافتی شعبوں میں بتدریج تبدیلی نے خاندان کے ادارے کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ 2015ء کا خاندان اپنی حرکیات میں قبل از تقسیم کے خاندان سے خاصا مختلف نظر آتا ہے۔ اب بتدریج اور روز افزوں رجحان یہ ہے کہ والد خاندان کے حکمران نہیں رہے بلکہ وہ دوست اور رہنما بنتے جارہے ہیں، مائیں اب بہترین مددگار اور نگہداشت فراہم کرتی ہیں لیکن ماضی کی طرح بچوں پر ان کا مکمل اختیار باقی نہیں رہا ہے۔بچوں کی آزادی اور انفرادیت بڑی تیزی سے قبولیت حاصل کرتی جارہی ہے اور انحراف اور اختلاف کو نافرمانی تصور نہیں کیا جاتا۔اب نوجوان افراد شادیوں کے سلسلے میں اپنے انتخاب اور فیصلے بہ اصرار منواتے ہیں۔ یہ ماضی سے برعکس صورتحال ہے کہ جب شادی کرنے والے جوڑوں کو ایک دوسرے کے بارے میں نہ کوئی معلومات فراہم کی جاتی تھیں اور نہ ہی شادی سے پہلے انہیں ان کے امکانی شریک حیات کی تصویر تک دکھلائی جاتی

تھی۔اب کورٹ میں کی جانے والی شادیوں کی تعداد میں اضافہ دیکھا جارہا ہے۔کراچی کی فیملی عدالتوں میں طلاقوں کی شرح بھی بڑھ رہی ہے۔ یہ صورتحال فی الوقت شہری مراکز میں زیادہ نمایاں ہے لیکن یہ ایک ایسا رجحان ہے جسے آگے ہی بڑھنا ہے۔اپنی مرضی کے خلاف شادی یا کسی اور شدید مسئلے پر احتجاجاً گھروں کو چھوڑنے والوں کی تعداد میں اضافہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اب بزرگوں کے لیے معاملات پر قابو پانا اتنا آسان نہیں رہا ہے۔اکائی خاندان، شہروں میں چھوٹی رہائش گاہیں، جدید تعلیم اور الیکٹرانک میڈیا اور سیل فون بھی انفرادی پسندی کو فروغ دے رہے ہیں۔

لڑکیوں کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے، اگرچہ بیٹے کی خواہش اور ترجیح اب بھی کافی حد تک موجود ہے۔اعلیٰ تعلیم اور ذاتی ملازمت کی وجہ سے مائیں چھوٹے خاندان کو ترجیح دیتی ہیں تاکہ وہ اپنی ترقی، بچوں پر خرچ، تفریح اور کیریئر بنانے کے لیے وقت نکال سکیں۔دو افراد کے کمانے والے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اس کے ساتھ ان کا طرز زندگی بھی تبدیل ہورہا ہے۔اب ایک چھوٹے، اسمارٹ اور ''پورٹ ایبل'' خاندان کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ خاندان کا حجم، شرح پیدائش (فی خاتون پیدا ہونے والے بچے) میں کمی کے باعث سکڑ گیا ہے۔ خاندان، ذات اور قبیلے کے اندر شادی کا رجحان کم ہورہا ہے۔اپنے حقوق کے بارے میں شعور اور آگہی بڑھ رہی ہے جس سے بچوں کے حقوق، شریک حیات کے حقوق، انسانی اور خواتین کے حقوق کے بارے میں گفتگو، گھریلو بات چیت کا حصہ بن گئی ہے۔ یہ صورتحال آج اگر چند خاندانوں تک محدود ہے تو کل یہ ایک عام بات بن سکتی ہے۔قدیم رسم ورواج اب جدید تہواروں کو راستہ دے رہے ہیں[۳۴]۔خاندان نے اب عالمی رابطے قائم کرلیے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بکھرا خاندان ایک حالیہ مظہر ہے جو خاندان کی حرکیات کو بھی تبدیل کررہا ہے۔نوجوان مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد ہوسٹلز اور کرائے کے گھروں میں رہتی ہے نیز خاتون سربراہ والے گھرانوں کے تعداد بھی قابل ذکر ہے۔زیادہ آمدنی والے خاندانوں میں ایک بچے کے ہونے کا

رجحان نمایاں ہے اور یہ رجحان درمیانی آمدنی رکھنے والے گھرانوں تک بھی پہنچے گا۔ ان تمام تبدیلیوں کے نتیجے میں روایتی خاندانی نظام اور اس کی حرکیات بھی تبدیل ہوئی ہیں اور اب زیادہ مساوات پسند خاندان ابھر رہے ہیں۔

ح:۔ صنفی توازن/عدم توازن: عورتوں کے لیے بڑھتی ہوئی گنجائش

پاکستان کا سماج انتہائی پدرسری رہا ہے جو اب اپنا پدرسری کردار تبدیل کرر ہا ہے اگرچہ یہ عمل بڑا سست رفتار ہے۔ خواتین کے مسائل اور حقوق کے بارے میں لبرل، سوشلسٹ، ریڈیکل اور اسلامی فیمنیسٹوں کے مختلف موقف اور ادراک پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجویز کردہ حل بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ عورتوں کے کمتر ہونے سے متعلق نظریے، مقامی، ثقافتی، اور مذہبی روایات سے قوت حاصل کرتے ہیں جو محنت کی صنفی تقسیم کار کی حمایت اور عورتوں کو گھریلو ذمہ داریاں تفویض کرتے ہیں، اس طرح مرد روزی کمانے والا اور گھرانے کا سربراہ بن جاتا ہے۔ اس موقف کو صرف اسلام پسند فیمنیسٹوں کی حمایت حاصل ہے۔ اسلام پسندوں کے نقطہ نظر کے مطابق کمانے کی ذمہ داری عورت کی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کا موقف ہے کہ عورتوں کو سیاست کے میدان میں بھی فعال نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے برعکس مختلف فیمنسٹ گروپ معاشی اور سیاسی شعبوں میں عورتوں کی زیادہ شرکت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ بحث اور مکالمہ اب صرف تعلیم یافتہ متوسط یا بالائی طبقے کے خاندانوں اور دانش وروں اور ذرائع ابلاغ تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب یہ مسئلہ پورے سماج کو متاثر کر چکا ہے جہاں پر دوسرے مرد اور عورت، دونوں کو زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً گھر، دفاتر، فیکٹریوں، عوامی مقامات، مارکیٹوں، پارلیمنٹ، مقامی کونسلوں، اسکولوں، مسجدوں، عدالتوں اور کھیتوں میں اپنے اپنے کردار کی حد بندی کرنی پڑتی ہے۔ صنفی مساوات پر شروع ہونے والا مباحثہ اب گہری جڑیں پکڑ چکا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف مختلف مؤقف ابھر کر سامنے آئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ عورتوں کے حقوق کو یقینی بنانے کے عمل کے

دوران کئی طرح کے تعصبات، کمزوریاں اور سماج کے مختلف حصوں کی امکانی قوت بھی اجاگر ہوئی ہے۔ عورتوں کے حقوق کی حتمی شکل اور گنجائش ابھی ایک متنازعہ معاملہ بنا ہوا ہے۔ اسلام پسند ابتدائی دور کے مسلمانوں کے طور طریقوں کو نمونہ قرار دے کر اس پر عمل کا تقاضہ کرتے ہیں جبکہ دوسرے اقوام متحدہ کے میثاقوں اور کنونشنز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ جس روز سے منبر پر انتہا پسندوں نے قبضہ کرلیا ہے قدامت پرست موقف اتنے زوردار انداز میں پیش کیا جارہا ہے کہ وہ دوسروں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ ''کہیں ہم ہی تو غلط نہیں ہیں؟'' کیا ہمیں خدا کو راضی رکھنے کے لیے حجاب پہننا اور گھر کے اندر رہنا چاہیے؟ کیا شوہر بیوی کو مارنے کا حق رکھتا ہے؟ اس طرح کی الجھنیں اور تذبذب کئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے۔

لڑکیوں کی زندگی میں سب سے خوفناک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ انہیں تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے اور ایسا بنیادی طور پر معاشی یا ثقافتی وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ پورے ملک میں 32 فیصد لڑکیوں کو ثقافت. کے نام پر اسکول جانے سے روکا گیا لیکن بلوچستان میں یہ تناسب بلند ترین 40 فیصد تھا[۳۵] ان عوامل کے باوجود تعلیم میں عورتوں کی مجموعی شرکت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ تعلیم کے حوالے سے سماج میں یہ ایک اچھا اور موزوں رجحان ہے۔

معیشت کی گلوبلائزیشن، غربت کی بڑھتی ہوئی سطحیں، مردوں میں بے روزگاری اور خود عورتوں کی اپنی تقدیر آپ بنانے کی شدید خواہش کی وجہ سے معاشی سرگرمیوں میں عورتوں کی شمولیت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اب وہ ہر طرح کے کام کررہی ہیں جن میں غیر ہنرمند سے لے کر اعلیٰ ٹیکنالوجی کے کام تک سب شامل ہیں۔ مزید برآں، سیاسی سرگرمیوں میں بھی ان کا کردار مزید بڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مخالفین مزید آمادۂ پیکار ہیں، ان کے رویے جارحانہ ہوگئے ہیں اور عورتوں کے حقوق کے حوالے سے نظریاتی تنازعات نے زیادہ شدت اختیار کرلی ہے۔

عورتوں کے حقوق کے موضوع نے بیک وقت ابھرنے والی کئی متضاد آرا جنہیں متناقض قرار

دیا جا سکتا ہے، کے باعث ایک متناقص شکل اختیار کر لی ہے۔ پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد قابل رشک ہے جس سے خطے میں ملک کو ایک قابل فخر حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ایوانوں میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں جو قوانین منظور ہوئے ہیں انہیں موجودہ صورتحال کو تبدیل کرنے کے لیے اب تک پوری طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ایک اور پیچیدہ صورتحال تعلیم یافتہ اور پیسہ کمانے والی ان عورتوں کو درپیش ہے جن پر کام کا دہرا بوجھ ہوتا ہے کیونکہ مرد حضرات گھریلو کام کاج میں عورتوں کا ہاتھ بٹانے میں بہ مشکل ہی کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل ہونے والی عورتوں کی تعداد ہمیشہ مردوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ مردانہ شاونیت کے لیے ''آسان ہدف'' ہوتی ہیں جنہیں اکثر مرد اپنے بدلے چکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے دشمن مرد کو ہلاک کر کے سزا سے بچنے کے لیے اپنے ہی خاندان کی کسی معصوم عورت کو قتل کر کے اسے غیرت کا مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ ثقافت، غیرت اور عزت اور سب سے بڑھ کر ''جذبۂ ایثار پسندی'' کے نام پر عورتوں کو مذہب کی طرف سے دیے گئے حقوق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس صورتحال میں عورت کو غیر موزوں، رواجی، تبادلے (وٹہ سٹہ) مصلحتاً یا جبری شادی کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اسے خود کو ایک ''فرمانبردار'' اور ''اچھی'' بیٹی ثابت کرنے کے لیے جائداد میں اپنے حصے سے دستبرداری اور دیگر جابرانہ سلوک و برتاؤ کے سامنے بھی ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے ''قرآن سے شادی'' کو غیر اسلامی اور سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے لیکن سندھ کے بعض علاقوں میں یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ عورتوں کو اپنا حق رائے دہندگی استعمال کرنے سے بھی روکا جاتا ہے اور سیاست میں ان کی شرکت کی اب بھی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ قبائلی، جاگیردارانہ اور پدرسری ذہنیت عورتوں کی راہ کی حقیقی رکاوٹ ہے۔ مردانہ انتہا پسندی عورتوں کے خلاف جرائم کو فروغ اور مجرموں کو تحفظ فراہم کرتی ہے اور جنسی جرائم کے واقعات میں عورتوں کو خاموشی اختیار کرنے کو کہا جاتا ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ صورتحال تقاضا کرتی ہے کہ ایک مثبت

نقطہ نظر کے ساتھ عورتوں کی، ایک مضبوط، با اعتماد، نڈر اور انفرادی طور پر طاقتور شخصیت کے طور پر پرورش کی جائے۔ امتیازی سوچ رکھنے والے سانچوں کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ عورت کو کم تر تصور کرنے والے نظریے کا خاتمہ کر دیا جائے۔ 'ڈے کیئر سینٹرز' کا قیام، کام کرنے والی عورتوں کا قانونی حق ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وعدے کو پورا کیا جانا چاہیے۔ غیر رسمی شعبے کو بھی مجبور کیا جائے کہ وہ ''مساوی کام کا مساوی معاوضہ'' کے اصول پر عملدرآمد کو یقینی بنائیں۔ عورتوں کے خلاف وسیع پیمانے پر ہونے والا تشدد یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مردوں کی طرح اپنا تحفظ نہیں کر سکتی ہیں لہٰذا مجرموں کو روکنے کے لیے سماج کو آگے بڑھ کر مؤثر اقدامات کے ذریعے کردار ادا کرنا چاہیے۔ عورتوں میں احساس تحفظ بڑھانے کے لیے دیگر ملکوں کے بہتر طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ہراسگی کے قانون کا اطلاق عام جگہوں پر بھی ہونا چاہیے۔ تعلیم عورتوں کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ط:۔ متوسط طبقے اور صارفین میں اضافہ

آمدنی کی سطح میں اضافہ کی وجہ سے صرف کا رجحان اور لوگوں کی ضروریات بھی تبدیل ہو چکی ہیں۔ صارفین کے ایک بڑے طبقے کے لوگوں کی وجہ سے جنہیں بیرون ملک سے ترسیلات ملتی رہی ہیں، لاہور کو ''بے تحاشہ اسراف والے شہر کا نمونہ'' کہا جاتا ہے[۳۶] یہ ایک جعلی متوسط طبقہ ہے جس کا طرز زندگی مڈل کلاس جیسا ہے لیکن اس کی اقدار نچلے طبقات جیسی ہیں کیونکہ انہیں یہ دولت ابھی حال ہی میں حاصل ہوئی ہے[۳۷] اس رجحان کا آغاز 1980ء کی دہائی میں ہوا اور ترقی کرتا رہا اور بڑی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ترسیلات کی مسلسل حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے۔ ترسیلات سے حاصل دولت سے گھروں، ملبوسات، کھانوں، مذہبی تقریبات، سیر و تفریح اور شادی بیاہ کی رسومات پر نظر فریب نمائشی اخراجات اور پیسہ خرچ کر کے لطف و مسرت حاصل کرنے کی اجتماعی نفسیات بدستور جاری ہے جس کے نتیجے میں امیر اور غریب دونوں اس رجحان کی پیروی کرنے کی

کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے معاشی اور سماجی شعبوں میں بھی کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن میں سب سے مہلک مسئلہ بدعنوانی کا ہے۔ جائز یا ناجائز ذرائع سے دولت کا حصول ایک ترجیح بن چکی ہے۔ حالیہ تخمینوں کے مطابق 13-2012ء میں بیرونی ترسیلات کی مالیت 13 ارب 92 کروڑ ڈالر تھی، غیر ملکی روزگار میں اضافے کی وجہ سے ان ترسیلات میں بھی اضافہ متوقع ہے۔ [۳۸]

اس صورتحال کے نتائج بھی یقیناً وہی نکلیں گے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

ی:۔ میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بڑھتا کردار

پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجیز کی حیران کن ترقی نے تبدیلی کے عمل میں ایک بڑی انوکھی اور تیکھی جہت کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب تک پیمرا کی جانب سے 91 سیٹلائٹ چینلوں، 193 ایف ایم ریڈیو اسٹیشنوں اور 3,629 ٹی وی آپریٹروں کو گزشتہ بارہ سالوں کے دوران کام کرنے کے اجازت نامے جاری کیے جا چکے ہیں۔ [۳۹] الیکٹرانک میڈیا میں اب تک 35 ارب امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری ہو چکی ہے اور اس سرمایہ کاری میں اضافہ ہو رہا ہے جبکہ یہ شعبہ اس وقت تقریباً 2 لاکھ افراد کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ ملازمتوں اور روزگار میں ہونے والا مجموعی اضافہ ان شعبوں میں کئی گنا زیادہ ہے جو الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں۔ ان میں صحافت، میڈیا ہاؤس پروفیشنلز، ایڈورٹائزنگ، پرفارمنگ آرٹ وغیرہ شامل ہیں۔ پی ٹی وی اس وقت ملک کے دور دراز علاقوں تک اپنی رسائی بڑھانے کے لیے چھ زمینی چینلز سے نشریات کر رہا ہے۔ [۴۰]

یہ اعداد و شمار اس وقت انتہائی متعلق ہو جاتے ہیں جب ہم، آگاہی، طرز زندگی، تعلیم اور صحت کی سہولیات کی طلب، ذاتی اور اجتماعی حقوق کے حصول کے لیے درکار علم، ترغیب اور قومی و عالمی برادری کے ساتھ رابطے کے گہرے احساس کے حوالے سے الیکٹرانک چینلز کے اثرات کا جائزہ

لیتے ہیں۔ آگے بڑھ کر عمل کرنے اور دنیا کو تبدیل کر دینے کی امنگ کے ساتھ اس کے بعض منفی عوامل بھی موجود ہیں جیسے کہ جرائم کی تشہیر وغیرہ۔ میڈیا کا دوسرا اہم کردار سیاسی ہے۔ یہ سماج میں سیاسی شعور پیدا کر سکتا ہے۔ میڈیا کی وجہ سے اگر لوگوں کی زندگیاں تبدیلی نہیں ہو سکتیں لیکن وہ آگاہی و معلومات کی فراہمی اور دوسروں کے احترام کے جذبے کو لوگوں میں ذہن نشین کر کے ان کے اندر قومیت کے احساس کو گہرا کر سکتا ہے۔ اسے کسی قوم کی تعمیر و تخریب، سماج کو مجموعی طور پر ترقی دینے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے یا انہیں برباد کرنے کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی کام کی حیرت انگیز ترقی [141] ، (ٹیلی۔ڈینسٹی 2014ء میں 78 فیصد تھی) بعض لوگوں کو آپس میں جوڑتی اور کاروباری لین دین کو سہولت فراہم کرتی ہے۔ یہ سماجی شعبوں یعنی تعلیم، صحت ریلیف اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ (تباہی کی انتظام کاری) وغیرہ کو ترقی دینے کے علاوہ عالمی رابطوں کو آگے بڑھانے کے علاوہ اور ان کے اثرات کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچاتی ہے۔ الیکٹرانک نیٹ ورک کا جدید و اختراعی استعمال، (ای بینکنگ، ای لرننگ، ای ہیلتھ، ای مارکیٹنگ) بھی اطلاعات کے عمل کو تیز تر کرتا ہے، اس طرح وہ تبدیلی کے عمل اور اس کے مثبت و منفی اثرات کو بھی آگے بڑھاتا ہے۔ انٹرنیٹ کا متعدد مقاصد کے لیے استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب سماج معلومات کی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے تو وہ اپنی سمت کا خود تعین کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسا مظہر ہے جو ابھی تحقیق اور تجزیے کا متقاضی ہے۔

باب ششم

عمرانی معاہدے کے لیے شعبوں کی شناخت اور سفارشات

گزشتہ ابواب میں درج بحث کی روشنی میں اتفاق رائے پیدا کرنے اور ملک میں عمرانی معاہدے کی گنجائش کو وسعت دینے کے لیے مخصوص شعبوں کی شناخت کی جاسکتی ہے۔

الف:۔ ریاست، آئین اور سیاست کی عملداری

1- پارلیمنٹ کو بااختیار اور سماج کے محروم حصوں کے لیے توسیع شدہ کردار کو یقینی بنا کر اسے ایک زیادہ نمائندہ ادارہ بنا کر سول۔فوجی عدم توازن کو درست کیا جاسکتا ہے۔

2- سیاسی جماعتوں کو داخلی طور پر مزید جمہوری بنایا جائے۔

3- سیاسی جماعتوں کے اندر تحقیق پر مبنی پالیسی کے ادراک اور پروگراموں کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔

4- فوجی بجٹ پر پارلیمنٹ کا کنٹرول ہو۔

5- سینیٹ کو مالیاتی بل پر اختیار رکھنے والا ایک براہ راست منتخب ادارہ بنا کر ایک وفاقی ادارے کے طور پر پارلیمنٹ کی حیثیت کو بڑھایا جائے۔

6- ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلقات زیادہ جمہوری بنائے جائیں۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ریاست کو غیر جانبدار بنایا جائے اور شہری کسی بھی علاقے، مذہب، نسل اور صنف کی تفریق کے بغیر مساوی بن جائیں۔

7- وفاق اور صوبوں کی متعلقہ آئینی عمل داریوں کو تسلیم کرتے ہوئے وفاق کو اور زیادہ معاون بنایا جائے۔

8- وفاق کے صوبوں کے ساتھ اور بین صوبہ جاتی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے فراہم کردہ آئینی اداروں، باڈیز اور نظام کو مضبوط کیا جائے۔

9- اٹھارہویں آئینی ترمیم کی شکل میں ہونے والی سیاسی اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے حوالے سے زیادہ مضبوط عزم کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ابتدا ہی سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ اب تک اقتدار پر قابض افراد، بعض ادارے اور بعض مرکزیت پسند ذہنیت کے حامل حلقوں کے لیے اٹھارہویں ترمیم اور اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

10- سیاسی جماعتوں کے درمیان زیادہ مضبوط عزم کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کی تیسری سطح یعنی مقامی حکومت کے اداروں کو حقیقت میں ڈھالا جاسکے۔

11- یہی وقت ہے کہ ان قبائلی علاقوں کی حیثیت کے بارے میں فیصلہ کرلیا جائے جو اب تک ملکی قوانین کی عمل داری سے باہر رہے ہیں۔

12- پاکستان کا سب سے بڑا بحران نظم حکمرانی کا ہے۔ ریاستی اداروں کی خرابی اور انہیں بدعنوانی کے لاحق مرض کے باعث ریاست کی عملداری کے بتدریج خاتمے اور ملک میں پیدا ہوجانے والے مختلف النوع مافیا اس بحران کی وجہ اور نتیجہ ہیں۔ نظمِ حکمرانی کے اس بحران پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

13- وقت گزرنے کے ساتھ ملک کی عدلیہ فوری اور سستا انصاف فراہم کرنے میں بری

طرح ناکام ثابت ہوئی ہے جس کی عکاسی جرائم میں اضافے سے ہوتی ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں عدالتی فعالیت صرف عدلیہ کی اعلیٰ ترین سطح تک محدود رہی ہے اور نچلی سطح تک عام آدمی کو فائدہ نہیں پہنچا سکی ہے۔

ب:۔ معیشت کی عملداری

1- سیاسی جماعتوں سے قطع نظر متعلقہ پالیسیوں اور پروگراموں کے ایسے متفقہ نکات تلاش کیے جائیں جن کی بنیاد پر وسیع تر اتفاق رائے پیدا کیا جاسکے۔

2- سیاسی جماعتیں، ملک کی اہم ترجیحات پر متفق ہوسکتی ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک روڈ میپ تیار کرسکتی ہیں۔

3- اتفاق رائے کا ایک دوسرا موضوع زرعی اصلاحات کا ہوسکتا ہے۔

4- وفاق اور صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کو کافی اہمیت دی جائے اور بے توجہی ولاپرواہی کے موجودہ رویے کو زیادہ فعال اور کارگزار رویے میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

5- غربت سے نجات، ترقی کے عمل میں علاقائی عدم مساوات اور ہر ایک کو وسائل کی تقسیم میں انصاف کی یقین دہانی جیسے معاملات پر اتفاق رائے پیدا کیا جاسکتا ہے۔

6- بہتر قوانین، ان کے نفاذ اور ٹھیکے داری نظام کی حوصلہ شکنی کے ذریعے مزدوروں اور کسانوں (کھیت مزدوروں) کے حقوق کو یقینی بنایا جائے۔

7- ایسے کارکنوں کو مزدور حقوق کے باضابطہ دائرے میں لایا جائے جن کا بھی کھاتوں میں کوئی اندراج نہیں کیا جاتا ہے تا کہ گھروں میں سے کام کرنے والے محنت کشوں، گھریلو ملازمین اور خاندان کے مددگار بھی تحفظاتی قوانین سے مستفید ہوسکیں۔

8- صارفین کے حقوق کو بھی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے ایک موضوع بنایا جائے۔

9- اسٹیٹ بینک کی خودمختاری یقینی بنائی جائے۔

ج:۔ سماج کی عملداری

1- پاکستانی سماج کو اسلحہ سے پاک کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

2- صوبوں میں داخلی نقل مکانی منصوبہ بند اور منظم انداز میں ہونی چاہیے تاکہ اس سے سماجی اور سیاسی مسائل پیدا نہ ہوسکیں۔

3- ملک کا ایک اور سماجی و سیاسی مسئلہ عدم رواداری اور شدت پسندی کا کلچر رہا ہے جس کی وجہ سے سالہا سال تک بے پناہ نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ انتہا پسند مذہبی اور نسلی تنظیموں نے معاشرے کو یرغمال بنالیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو آپس میں یہ مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کلچر کو رواداری، تنوع کی قبولیت اور سماجی ہم آہنگی کی یقینیت کے ساتھ کس طرح تبدیل کیا جائے۔

4- ملک کے تعلیمی نظام کا بڑے پیمانے پر جائزہ لینے اور اسے بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی شعبے میں تحریفات، خاص طور پر متعدد نظاموں کی موجودگی کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

5- طالب علموں کو پڑھائے جانے والے نصابوں اور کورس کی کتابوں کو عقلیت پسند، معروضی، پیشہ ورانہ اور نظریاتی، مذہبی، علاقائی، نسلی اور صنفی تعصّبات سے پاک بنانا چاہیے۔

6- عصر حاضر اور جدید طرزِ بود و باش میں میڈیا کی اہمیت کے باعث میڈیا کی سماجی ذمہ داری توجہ کا مرکز ہونی چاہیے۔

7- میڈیا کی آزادی میں خلل اندازی اور بگاڑ پیدا کیے بغیر، اس پر کارپوریٹ سیکٹر کی موجودہ اجارہ داری اور نتیجے کے طور پر عوامی حلقے میں اس کی اس حد تک دخل اندازی کو روکنا ضروری ہے کہ اول الذکر، مؤخر الذکر کا خاتمہ ہی کردے۔

8- عورتوں کی سماجی بندش سے آزادی اور زندگی کے ہر میدان میں شرکت کو مستقبل کے عمرانی معاہدے کا مرکزی نکتہ بنایا جانا چاہیے۔

9- ملک کے بعض علاقوں میں خواتین کو عام انتخابات میں حصہ لینے اور حق رائے دہی سے

روکنے کی روایت کے عمل اور روایت سے معنی خیز طور پر نمٹنے کی ضرورت ہے۔

10- مخصوص ملازمتوں سے عورتوں کی بندش ختم کر دینی چاہیے۔ بعض حدود سے آگے ترقی اور بعض اعلیٰ عہدوں کے لیے ان کی نااہلیت، قومی تعمیر میں ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی راہ میں ایک اور رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو ریاستی اداروں، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کے مشترکہ عزم سے دور کیا جانا چاہیے۔

11- بچوں کے حقوق کو تسلیم کیے جانے کی ضرورت ہے اور سماجی سطح پر ان کے بارے میں آگاہی کو یقینی بنانے اور قوانین کے ذریعے ان کو تحفظ دیے جانے کی ضرورت ہے

12- مختلف مذہبی برادریوں کو اظہار کی آزادی اور اپنے عقائد پر عمل کی مکمل آزادی کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ مذہبی برادریوں کو اکثریت یا اقلیت میں شمار کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل قومی تعمیر کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ ان برادریوں کو اکثریتی یا اقلیتی کہنے کے بجائے پاکستان کے مسلم شہری، مسیحی شہری، ہندو شہری وغیرہ کے طور پر شناخت کیا جا سکتا ہے۔

13- ماحول کے حوالے سے موجودہ سماجی رویے بھی باعث تشویش ہونے چاہئیں، ایک ماحول دوست سماج کی تخلیق مستقبل کے عمرانی معاہدے کا ایک جز ہونا چاہیے۔

باب ہفتم

صوبائی تناظر

پاکستان میں موجود عمرانی معاہدے (جو ۱۹۷۳ء کے آئین کی شکل میں پایا جاتا ہے) کی تجدید اور اس کی توسیع کے نقطۂ نظر سے جو تحقیق کی گئی اور جس پر زیرِ نظر کتاب مشتمل ہے، اس کے حوالے سے ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں، سیاسی کارکنوں، سول سوسائٹی کے نمائندوں، دانش وروں اور علمی حلقوں سے مشاورت کے بعد جب ایک ابتدائی مسودہ تیار ہو گیا تو اسے وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں ہمیں جو آراء اور تبصرے موصول ہوئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مختلف صوبوں کے بعض حلقے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسودے میں صوبائی نقطہ نظر کو زیادہ نمایاں اور انتہائی احتیاط سے شامل کیا جانا چاہیے۔ ان آرا اور ردِ عمل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں علیحدہ مشاورتیں کی گئیں۔ ہر صوبے میں، زندگی کے وسیع تر حصوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اس مشاورتی عمل میں شریک کیا گیا۔ گلگت بلتستان میں بھی ایک علیحدہ مشاورت کی گئی۔

ان مشاورتوں کے نتیجے میں جو افکار اور سفارشات سامنے آئیں ان میں سے بہت سفارشات قومی سطح پر ہونے والی سابقہ مشاورت کی بنیاد پر مرتب کردہ رپورٹ میں پہلے سے شامل سفارشات کی تکرار تھیں۔ تاہم، صوبائی مجالس میں ان سفارشات پر چونکہ بھرپور انداز میں زور دیا گیا تھا لہٰذا فیصلہ یہ کیا گیا کہ انہیں زیرِ نظر باب میں نمایاں طور پر الگ اجاگر کر دیا جائے۔ علاوہ

ازیں، صوبائی مشاورتوں میں کئی نکات خصوصی طور پر اٹھائے گئے تھے۔ انہیں بھی اس باب میں شامل کیا جارہا ہے۔

الف:۔ خیبر پختونخوا

1- قرارداد مقاصد چونکہ متنازعہ ہوچکی ہے لہٰذا اس پر بحث کرنے اوراس کے مضمرات کا تعین کرنے کی ضرورت ہے۔ مشاورت میں جن لوگوں کو شریک کیا گیا ان میں سے کئی کا یہ موقف تھا کہ قرارداد مقاصد کی موجودگی میں پارلیمنٹ کی بالادستی پر سمجھوتا کرنے کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔

2- آئین میں شہریوں کو مساوی حقوق دینے کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن جب صدر اور وزیر اعظم کے منصب اور عہدوں کا معاملہ سامنے آتا ہے تو خود آئین ان کے بارے میں تفریق روا رکھتا ہے۔ اس تضاد کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور آئین کے کسی آرٹیکل کے ذریعے شہریوں کے مساوی حقوق کے حوالے سے کوئی امتیاز یا سمجھوتہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

3- خارجہ پالیسی، اندرونی و بیرونی سلامتی اور عسکری بجٹ جیسے امور پر پارلیمنٹ کی بلاشرکت غیرے فوقیت کو قبول کیے بغیر پارلیمنٹ کی بالادستی ممکن نہیں ہوسکتی۔

4- وسائل کی تقسیم کے نظام کو زیادہ منصفانہ اور وفاقی اکائیوں کی امنگوں کے مطابق بنایا جانا چاہیے۔

5- ملک کی تقریباً 80 فیصد معیشت کی دستاویز بند نہیں ہے۔ معیشت کو دستاویزی بنائے بغیر ریاست کے لیے ٹھوس بنیادوں پر مستقبل کی منصوبہ بندی ممکن نہیں۔

6- سول۔فوجی تعلقات میں موجود عدم توازن کو درست کیا جائے اور فوج کو لفظی اور حقیقی دونوں معنوں میں سویلین حکومت کے ماتحت کیا جائے۔

7- مذہبی درس گاہوں اور مدارس کو ہر آنے والی حکومت اور انتہا پسند تنظیموں نے اپنے سیاسی

مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مدرسہ تعلیم کے پورے نظام کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، یہاں پڑھائے جانے والے نظام کی اصلاح کی جائے اور اسے جدید بنایا جائے۔ بالخصوص طالب علموں کو سائنس کے مضمون پڑھائے جائیں جیسا کہ ملک کے مرکزی تعلیمی نظام میں کیا جاتا ہے۔ ان تعلیمی اداروں کو سوائے تعلیم اور اس سے متعلق سرگرمیوں کے علاوہ کوئی اور سرگرمی تفویض نہ کی جائے۔

8- آئین میں ہونے والی اٹھارہویں ترمیم کے تحت دی گئی صوبائی خودمختاری کا مکمل اطلاق نہیں کیا گیا ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کا بلا تاخیر اطلاق کیا جائے کیونکہ اس ترمیم کو منظور اور آئین کا حصہ بنائے ہوئے پہلے ہی سات سال گزر چکے ہیں۔

9- فاٹا کو ترجیحی بنیادوں پر خطے کے لوگوں کی امنگوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خیبر پختون خوا میں شامل کیا جائے۔

10- سیاسی جماعتوں کا ڈھانچہ انتہائی مرکزیت کا حامل ہے۔ سیاسی جماعتوں کو جمہوری بنانے کی ضرورت ہے۔

11- چین۔ پاکستان اکنامک کوریڈور (CEPEC) کو تمام صوبوں اور وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے لیے فائدہ مند بنایا جائے۔

12- ملک میں قومیتوں کے وجود کو آئین میں تسلیم کیا جانا چاہیے۔

13- قومی اسمبلی میں مزدوروں کو نمائندگی دی جائے۔

14- صنفی امتیاز کا مکمل خاتمہ کیا جائے۔

ب:۔ بلوچستان

1- بلوچستان متنوع نسلی، لسانی اور ثقافتی اکائیوں پر مشتمل صوبہ ہے۔ یہاں بلوچ اور پختون دو بڑے نسلی گروہ آباد ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہاں ایک مضبوط احساس یہ ابھرا ہے کہ

صوبے کے اموراس طرح چلائے جائیں کہ تمام نسلی گروہ خود کو محفوظ تصور کریں اوران میں سے کسی کے اندر، دوسروں کی جانب سے اپنی بیخ کنی کیے جانے کا احساس پیدا نہ ہو۔

2- سینیٹ کے اراکین کو عوام براہ راست منتخب کریں اوراس کے دائرہ اختیار کو مالیاتی بلز تک توسیع دی جائے۔

3- بلوچستان کو پاکستان کی کارپوریشنوں میں نمائندگی دی جائے۔

4- مشترکہ فہرست (کنکرنٹ لسٹ) کے خاتمے کے بعد بھی عملاً بلوچستان کو اپنی معدنیات اور ساحلی وسائل پر اختیار رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے حالانکہ اٹھارہویں ترمیم کے تحت صوبے کو اس کا حق حاصل ہے۔

5- بلوچستان اسمبلی نے اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت تفویض کردہ اپنی نئی ذمہ داریوں کی روشنی میں کئی قوانین منظور کیے ہیں۔ تاہم، زیادہ تر معاملات میں بائی لاز نہیں بنائے گئے ہیں جس کے نتیجے میں ان قوانین کا نفاذ ممکن نہیں ہوسکا ہے۔

6- ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے نمائندوں نے انتہائی مضبوط انداز میں یہ موقف پیش کیا کہ کوئٹہ شہر میں صرف ہزارہ برادری کی 5 لاکھ کی آبادی دیگر تمام برادریوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔ ان کی برادری کے لوگوں کو انتہا پسند فرقہ پرست تنظیموں کی جانب سے نشانہ بنایا گیا ہے جس میں اب تک ہزارہ برادری کے سینکڑوں افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ ان کا تحفظ کیا جائے اور انہیں ملک میں آزاد شہری کے طور پر رہنے کا حق دیا جائے۔

7- سینیٹ میں مساوی نمائندگی کے ذریعے چھوٹے صوبوں کے حقوق کو یقینی بنایا گیا تھا لیکن قبائلی علاقوں کو سینیٹ میں نمائندگی دے کر چھوٹے صوبوں کی نمائندگی کو بے اثر بنا دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قبائلی علاقوں کو ان صوبوں میں ضم کردیا جائے جہاں وہ واقع ہیں۔

8- افغان مہاجرین کی موجودگی سے صوبے کا آبادیاتی نقشہ نمایاں طور پر اثر انداز ہوا ہے۔ ان کی موجودگی کو اکثر ایک کمیونٹی کی جانب سے دوسری کمیونٹی پر اپنی عددی قوت بڑھانے کے ایک

ذریعہ کے طور پر تشریح کی جاتی ہے۔لہٰذا یہ سفارش کی جاتی ہے کہ افغان مہاجرین کو جتنا جلد ممکن ہو سکے ان کے ملک واپس بھیج دیا جائے۔

9- اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے معدنیات اور ساحلی وسائل کی آدھی ملکیت صوبے اور آدھی وفاق کو دی گئی ہے۔تاہم، اب تک اس اصول پر عمل کرنے کا کوئی نظام وضع نہیں کیا گیا ہے۔

10- کوئٹہ میں مختلف نسلی گروہوں یعنی پشتون، بلوچ، براہویوں کی متعلقہ حیثیت کے مسئلے کو جمہوری فورموں میں زیر بحث لانا چاہیے اور اسے تمام اسٹیک ہولڈرز کے اطمینان کے مطابق حل کرنا چاہیے۔

11- پاکستان کو ایک جدید جمہوری ریاست اور قرارداد مقاصد کو درست کہنے کا موقف ایک ساتھ اختیار کرنے کو لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے پیچیدہ مسئلہ قرار دیا۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ چونکہ آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے قرارداد مقاصد کو جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں آئین کا ایک آپریشنل حصہ بنا دیا گیا تھا لہٰذا اسے آئین سے خارج کر دیا جائے یا پھر آٹھویں ترمیم سے پہلے کی طرح اسے تمہید کے طور پر استعمال کیا جائے۔

ج:۔ سندھ

1- سندھ کے حقیقی سندھیوں کو یہ خوف ہے کہ مختلف علاقوں سے بھاری تعداد میں لوگوں کی کراچی آمد کے باعث وہ تیزی سے اپنی اکثریت کھوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے مختلف صوبوں سے ہونے والی داخلی ہجرت اور بیرون ملک سے کراچی میں آ کر آباد ہونے کے مسئلہ پر قابو پایا جائے۔

2- ہندوؤں کی جانب سے مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے کا معاملہ اب ایک سنجیدہ مسئلے کی شکل اختیار کر گیا ہے، کیونکہ زیادہ تر معاملات میں مذہب کی تبدیلی کا یہ عمل رضا کارانہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ کہا گیا کہ اقلیتی برادری کے غریب لوگوں کو رشوت دے کر ان کا مذہب تبدیل کرایا

جارہا ہے۔ اکثر غیر مسلم لڑکیوں کو ازدواجی مقاصد کے لیے مذہب کی تبدیلی پر مجبور کیا گیا ہے۔ مذہب کی جبری تبدیلی کو روکنے کے لیے سخت قانونی اور انتظامی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

3- اس امر کی آئینی ضمانت فراہم کی جائے کہ سندھ کو 1991 کے آبی معاہدے کے مطابق طے شدہ پانی کا حصہ ملتا رہے گا۔

4- افغان، بنگلہ دیشیوں اور برمی غیر ملکی مہاجرین اور تارکین وطن کارکنوں کی حیثیت کی واضح شناخت کی جائے تاکہ ان کا کسی بھی طرح پاکستانی شہری کے طور پر شمار نہ کیا جا سکے۔

5- عدلیہ کی آزادی اور سندھ پبلک کمیشن جیسے دیگر اداروں کی آزادی یقینی بنائی جائے۔

6- ہاؤسنگ کے لیے زمینوں کو الاٹ کرنے کے ضمن میں ایک واضح اور مخصوص لینڈ پالیسی ہونی چاہیے۔

7- کنٹونمنٹ اور ان کے ذیلی کاروباری اداروں کو باقاعدہ بنا کر انہیں وفاقی یا صوبائی قوانین کے دائرہ اختیار میں لایا جائے۔

8- سندھ میں مقامی حکومت کے ادارے بہت زیادہ کمزور ہیں۔ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ صوبائی حکومت، مقامی حکومت کے نظام کو انتظامی اور مالی خودمختاری کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ وفاق کی ایک حقیقی تیسری سطح کے حوالے سے مقامی حکومتوں کے کردار پر سیاسی جماعتوں کو کسی اتفاق رائے پر لانا ضروری ہے۔

د:۔ پنجاب

1- کافی سالوں سے پنجاب انتہا پسند تنظیموں کا بڑا مرکز بن چکا ہے۔ صوبے میں نہ صرف تشدد کے سینکڑوں واقعات ہوئے ہیں بلکہ انتہا پسند رویوں سے اس کا مجموعی سیاسی کلچر بھی متاثر ہوا ہے۔ انتہا پسند تنظیموں نے حکومتوں کی متواتر سرپرستی سے فیض اٹھایا جس کے نتیجے میں وہ صوبے کی سیاست میں بھی نفوذ کر گئی ہیں۔ یہ مستقبل کا ایک بڑا چیلنج ہے جس کا سامنا سنجیدگی سے کرنے کی

ضرورت ہے۔

2- پنجاب کی سرائیکی پٹی میں ایسے سیاسی اور سماجی گروہ موجود ہیں جو اپنے خطے کی ایک علیحدہ سیاسی شناخت کے لیے مسلسل آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ سرائیکی صوبے کی تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مذکورہ مسئلے کو لوگوں کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے۔

3- ساتویں این ایف سی ایوارڈ میں پنجاب کے حصے کا اس وقت دوبارہ تعین کیا گیا جب محصولات کی تقسیم کے لیے آبادی کی بنیاد پر وضع کردہ واحد معیار کی جگہ آبادی سمیت کئی عوامل پر مشتمل ایک نیا فارمولا اپنایا گیا تھا۔ تاہم، لوگوں کا ایک حصہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ایوارڈ کا فیصلہ کرتے وقت صوبے میں غربت کی سطح کو بھی مناسب اہمیت دی جانی چاہیے۔

4- صوبے کے بعض علاقوں میں موجود جرگہ نظام کو اس عام قانونی نظام میں تبدیل کر دینا چاہیے جو صوبے کے زیادہ تر حصوں میں رائج ہے۔

5- صوبے میں موجود علاقائی عدم مساوات کے خاتمے اور صوبے میں وسائل کی منصفانہ تقسیم کے نظام کو یقینی بنایا جائے۔

ز:۔ گلگت۔ بلتستان

1- گلگت بلتستان کی غیر تصفیہ شدہ حیثیت ایک اہم مسئلہ ہے جسے سیاسی کارکنوں، صحافیوں، سول سوسائٹی کی تنظیموں، دانشوروں، پروفیشنلز اور طلبہ نے اجاگر کیا ہے۔ یہ تمام عناصر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے علاقے کی حیثیت اس طرح طے کی جائے کہ گلگت۔ بلتستان میں آئینی، قانونی اور انتظامی ڈھانچے قائم کیے جا سکیں۔

2- تاریخی اور سیاسی عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے گلگت۔ بلتستان کا آزاد کشمیر کے ساتھ تعلق کا بھی فیصلہ کیا جائے۔

3- گلگت۔ بلتستان کے اس خطے کے، آزاد کشمیر کے ساتھ انضمام کے بارے میں بھی مختلف

آرا پائی جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے اس مسئلے نے فرقہ وارانہ رنگ بھی اختیار کرلیا ہے۔

4- اس خطے کی ایک غیر واضح حیثیت کی وجہ سے گلگت ۔ بلتستان کے لوگ شناخت کے بحران کا بھی شکار ہیں۔

5- اس حقیقت کے باعث حقوق انسانی کے مسائل مزید سنجیدگی اختیار کر گئے ہیں کہ اس خطے کو وہ قانونی اور آئینی تحفظات فراہم نہیں کیے گئے جو دوسرے صوبوں میں رہنے والوں کو حاصل ہیں۔

6- گلگت ۔بلتستان کو سی پیک پر سخت تحفظات ہیں۔ اس کا نقطہ نظر ہے کہ سی پیک سے وابستہ انفراسٹرکچر اور انسٹی ٹیوشنل نیٹ ورک کو اس خطے میں ترقی دینی چاہیے تا کہ یہاں رہنے والے لوگ اس سے فائدہ حاصل کرسکیں۔

7- گلگت ۔بلتستان کے نمائندے این ایف سی اور سی سی آئی میں بھی نمائندگی چاہتے ہیں۔

8- گلگت ۔بلتستان نے وفاقی حکومت کے مرکزیت پسند رجحان پر بھی تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ یہ خطہ کوئی صوبہ نہیں ہے اور اسے مرکز کنٹرول کرتا ہے لہٰذا وہاں یہ احساس موجود ہے کہ ان کا علاقہ مرکز کے احکامات کے تابع ہے۔

9- یہ مطالبہ شدت سے کیا جاتا ہے کہ یہاں بھی دیگر صوبوں کی طرح حکومتی خوداختیاری کا نظام رائج کیا جائے۔

10- گلگت ۔بلتستان کا یہ بھی خیال ہے کہ وفاقی حکومت کو سیاحت سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس میں سے گلگت ۔بلتستان کو اس کا جائزہ حصہ نہیں دیا جاتا۔

11- گلگت بلتستان کو یہ بھی خوف درپیش ہے کہ اگر کسی نئے عمرانی معاہدے کو عمل میں لانے کی کوشش کی بھی جائے گی تو اس کی تشکیل میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔

اختتامیہ

پاکستانی ریاست اور سماج کے تین بڑے حصوں کے جائزے اور ان کے تنقیدی تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن شعبوں میں پہلے اتفاق رائے حاصل کرلیا گیا ہے اور جن پر آج تک غور وخوض نہیں کیا گیا، دونوں پر اتفاق رائے پیدا کرنے اور مذاکرات کے ذریعے تصفیوں کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ بعض باقاعدہ شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سیاسی طبقے کی جانب سے بات چیت کے لیے پہل کاری کی جاسکتی ہے۔ تاہم، یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ تمام ذمہ داری سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین پر نہیں عائد کی جاسکتی۔ سول سوسائٹی کو بھی معاہداتی، سماجی، معاشی اور سیاسی حل پر زور دینا چاہیے۔ لہٰذا یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ریاست اور سماج کے بنیادی اور اساسی پہلوؤں پر عمرانی معاہدہ تیار کرنے کے لیے پارلیمنٹ، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو شامل کرتے ہوئے ایک نئے بیانیے کا آغاز جلد از جلد کیا جانا چاہیے۔

References

1. See Hamza Alavi, Formation of the Social Structure of South Asia Under the Impact of Colonialism', in his and John Harris (eds.), *Sociology of Developing Societies South Asia* (London: Macmillan, 1989); and also his, 'Structure of Colonial Social Formation', *Economic and Political Weekly*, Vol XIV, Nos.10, 11 &12,1981.

2. See Syed Jaffar Ahmed,'Sherwanis and Turbasn: How and Why the Feudal and other Privileged Classes Supported the Pakistan Movement', *Pakistan Perspectives*, Vol.8, Nos.1 & 2, January-December 2003.

3. Zafarullah Khan, ww.civiceducation.org.

4. See the interview of formerLaw Minister, Abdul Hafeez Pirzada in Syed Jaffar Ahmed, *Confederation Rah-e-Nijaat ya Rah-e-Farar*(Urdu) (Karachi: Matbooaat-e-Mahmood,1988), p.174.

5. Afshan Subohi, 'Move for National Consensus Deal', *Dawn,* Economic & Business Review,2 March 2015.

6. *Ibid*

7. Mian Raza Rabbani, *A Biography of Pakistani Federalism Unity in Diversity* (Islamabad: Leo Books, [2012]), pp 129-36. This was also confirmed to the present writer by Rabbani in a

personal communication.

8. Dr Haseeb Bhatti, 'Charter of Economy or Inequality', *The Nation*, 2 March 2015

9. *Ibid*

10. Zeeshan Haider,'Fixing Economy Through 'Charter', *The News*, 2 March 2015.

11. *Ibid*

12. Dr Muhammad Yaqoob,'Charter of Economy', *The News*, 3 March 2015.

13. *Ibid*

14. *Ibid*

15. It is higher than average of the South Asia region

16. *Pakistan Economic Survey 2013-14*, hereinafter PES, p.179.

17. Quoted in *State of Human Rights in Pakistan 2013* (Lahore: Human Rights, Commission of Pakistan, 2014), hereinafter *HRCP report*, chapter on Health.

18. PES, p.179

19. It is believed to be caused by poverty, malnutrition, and poor heath of mother, short-spaced pregnancies, poor sanitation, water-borne diseases, lack of medical care, and lack of awareness among uneducated and rural families.

20. In the census of 1951, 1961 and 1972 an urban area was defined as the locality having population base of 5000 persosn. In 1998 census urban area included all the metropolitan

corporations, municipal corporations, municipal committees, town committees or cantonments. The town committee was at that time defined as a locality having a population from 10,000 to 30,000. Social Policy Development Centre, *Social Development in Pakistan Annual Review 2012-13* hereinafter SPDC report, p.3.

21. PES, p.182.

22. *SPDC report*, Table 1.4,p.5

23. PES, p.188.

24. Arif Hasan, *The Unplanned Revolution Observation on the Process of Socio-economic Change in Pakistan* (Karachi: Oxford University Press, 2002), p.xiv.

25. SPDC report, p.54.

26. *Ibid*, Table 4.5, p.60.

27. PES, pp. xi-xii. It is indicated that Pakistan has improved its status regarding higher education from 125th among 189 countries to 21st in year 2012, definitely a happy sign. But there is also a distortion in spending as the primary education must be given priority in view of high rate of illiteracy and out of schools children.

28. *HRCP report*, chapter on education

29. At least the administration of 500 seminaries was found having extremist views and was receiving foreign donation as well. *Ibid*.

30. See for details *ibid*.

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ(IHSR) کراچی (پاکستان) میں قائم ایک تحقیقی ادارہ ہے جو ایک متحرک، ترقی پسند اور عوام دوست وژن کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ ایس۔ ایم۔ سہیل ٹرسٹ کے تحت قائم ہونے والا یہ انسٹی ٹیوٹ ایک آزاد اور غیر منافع بخش ادارے کی حیثیت رکھتا ہے جو تاریخی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر، خاص طور سے پاکستان کے حوالے سے، تحقیقات کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہونے والی تحقیقات میں خواہ وہ کسی ایک سماجی علم کے دائرے میں رہ کر کی گئی ہوں یا ان میں مختلف علوم کے امتزاج(Multi-disciplinarity) کی کارفرمائی ہو، جدید منہاجِ تحقیق (Research Methodology) کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

تاریخ کے موضوع پر انسٹی ٹیوٹ کی تحقیقات، روایتی تاریخ نویسی سے ہٹتے ہوئے، عوام کے نقطۂ نظر سے تاریخ کو پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان تحقیقات کا مقصد تاریخ میں ایک عام آدمی کے کردار، ماضی کے مختلف ادوار کے سماجی و سیاسی رجحانات، عام لوگوں کے اخلاق و مزاج اور ان کی قدروں کو اجاگر کرنا ہے۔ عوام کو تاریخ کا موضوع بنانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے ارتقائی عمل کے پیچھے کارفرما سب سے فعال قوت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ تب تاریخ کا ایک ایسا بیانیہ وجود میں آتا ہے جو مابعد الطبیعیاتی، خیالی اور افسانہ و افسوں پر مشتمل بیانیوں کے مقابلے میں ایک سائنسی نظر فراہم کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ اسی سائنسی نقطۂ نظر کو تاریخ کی تفہیم کے حوالے سے اپنے ملک اور معاشرے میں عام ہوتا دیکھنا چاہتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا یہ سب کام کتابوں، مونوگرافس، کتابچوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کی صورت میں اظہار پاتا ہے۔

سماجی امور پر تحقیق کے حوالے سے انسٹی ٹیوٹ ملک کے سماجی و سیاسی اور اقتصادی مسائل پر تحقیق کا کام کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس کی حیثیت ایک ایسے تھنک ٹینک کی ہے جو ایک جانب پاکستان میں سماجی ارتقاء کی نوعیت اور اس کے رخ پر نظر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری جانب موجود مسائل کے معروضی تجزیوں کے نتیجے میں ایسی تجاویز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک عام شہری کی بہبود، اس کی خوشی اور کامرانی کا وسیلہ بن سکے۔

چیئرمین
ڈاکٹر طارق سہیل

ڈائریکٹر
ڈاکٹر سیّد جعفر احمد